ماہنامہ
پیام عرفات
رائے بریلی

قربانی کی حقیقت

”قربانی کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے آدمی اپنے ارادہ، اپنی خواہش، اپنی عادت، اور اپنے مزاج کے گلے پر چھری پھیرے، اپنے دل کے کہنے پر نہیں، خدا اور رسول کے کہنے پر چلنے کا فیصلہ کرے، اور اس قسم کے ہر موڑ پر خدا کے ڈر اور آخرت میں جواب دہی کے خیال سے برائی سے اپنا ہاتھ روک لے، اور دل پر پتھر رکھ کر اس سے باز رہے؛ ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى﴾ (ور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس نے خواہشات سے روکا تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے)۔“

صحافی اسلام مولانا محمد الحسنی (بانی مدیر ماہنامہ تعمیر حیات، ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

ہندستانی مسلمانوں کا فیصلہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

”ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری یا بے چارگی پر مبنی نہیں، ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانون شریعت اور اپنی پوری مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔

اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور و آئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی خصوصیات، قانون شریعت، احکام دین، اپنے عقائد و شعائر، اپنی زبان و تہذیب اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں اس ملک میں رہیں، اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے اور مسلمان جس ملک میں رہے گا اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر و ترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں، اس لیے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

زندگی اور موت بھی اسلام پر ہوگی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسلام اور ایمان پر قائم رہنے کی کوشش کریں، اسی پر اپنی زندگی گزاریں اور جب موت آئے تو اسی دین و ملت پر آئے: ﴿ولا تموتن إلا و أنتم مسلمون﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۳۲) (تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو)“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد:۹ ستمبر ۲۰۱۷ء شمارہ:۹

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

نگراں: مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ (جنرل سکریٹری، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

قربانی کا مقصد

﴿لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ﴾

(اللہ کو ان کا گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتا، ہاں اس کو تو تمہارے (دل) کا تقویٰ پہنچتا ہے، اللہ نے اسی طرح ان کو تمہارے قابو میں کردیا ہے تاکہ تمہیں اللہ نے جو ہدایت عطا فرمادی اس پر اس کی بڑائی بیان کرو اور آپ بہتر کام کرنے والوں کو بشارت دے دیجیے)

(الحج: ۳۷)

فی شمارہ: -/Rs.10 Mail: markazulimam@gmail.com سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فہرس

موجودہ ہندوستان اور مسلمان (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

حج کی سوغات.....۴

.....مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

توحید کیا ہے؟.....۵

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

سجدہ سہو کے احکام ومسائل.....۷

.....مفتی راشد حسین ندوی

فراعنۂ مصر-تاریخ کے آئینہ میں.....۹

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

کامیابی کا مدار ایمان وعمل صالح میں ہے.....۱۲

.....محمد امین حسنی ندوی

محبت اور نفرت کا معیار.....۱۴

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

عیدالاضحیٰ-چند ضروری احکام ومسائل.....۱۵

قربانی کی اصل روح.....۱۸

.....محمد نفیس خاں ندوی

روضے کا منظر

نتیجۂ فکر:- محمد زکی کیفیؒ

مدینہ کے رہبر و بیاباں بیاباں
چلے جارہے ہیں غزل خواں غزل خواں

ہے بزم تصور میں روضے کا منظر
نگاہوں کا عالم گلستاں گلستاں

قریب آگیا ہے دیار مدینہ
غم زندگی ہے گریزاں گریزاں

وہ دنیا کی جنت مدینہ کی بستی
جہاں ذرہ ذرہ زرا فشاں زرا فشاں

یہاں ہر نفس ہے معطر معطر
یہاں زلف نکہت پریشاں پریشاں

یہاں خار وخس کے جلو میں ملی ہیں
ہزاروں بہاریں خراماں خراماں

یہاں مست ہیں سب برے بھی بھلے بھی
ہے سب پر عنایت فراواں فراواں

یہاں بے بصر بھی عیاں دیکھتے ہیں
نقوش محبت فروزاں فروزاں

یہیں سے ملا تھا، یہیں مل سکے گا
سکونِ دل و جاں، سکون دل و جاں

کرشمے ہیں ان کی نگاہ کرم کے
خیاباں خیاباں، بہاراں بہاراں

خدا دن وہ لائے مدینہ میں پہنچے
گنہگار کیفی، پشیماں پشیماں

مدیر کے قلم سے

موجودہ ہندوستان اور مسلمان

بلال عبدالحی حسنی ندوی

اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخ بہت قدیم ہے، پہلی صدی ہجری کے اوائل میں ہی اسلام نے سب سے پہلے کیرلا کی سرزمین پر اپنے قدم رکھے، یہاں کے راجہ ''چیرامن پیرومل'' نے اسلام قبول کیا، اور اس ملک میں سب سے پہلی مسجد تعمیر کرائی، محمد بن قاسمؒ دوسری صدی میں سندھ کے راستہ سے داخل ہوئے اور اپنے اسلامی اخلاق وکردار سے بہت جلد یہاں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر چلے گئے، شاید تاریخ کا انوکھا واقعہ ہوگا کہ کسی فاتح کے جانے پر ایسا غم منایا گیا ہو جو محمد بن قاسمؒ کے جانے کا منایا گیا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے فاتحین آتے رہے، محمود غزنوی کا نام اس فہرست میں نمایاں ہے جس نے باقاعدہ پہلی مرتبہ یہاں قدم جمائے، اسی لیے اس کو فاتح ہندوستان کہا جاتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کو جس ذات نے فتح کیا وہ بزور شمشیر نہیں بلکہ وہ اخلاق ومحبت کی جہانگیری تھی جس نے لاکھوں لوگوں کے دلوں کو فتح کیا، اور وہ ذات حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی تھی۔

اسلام سے پہلے یہ ملک رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا، متحدہ ہندوستان کی بنا مسلمانوں نے ڈالی اور پھر مغل دور میں ہندوستان کی سرحدیں اپنی وسعت میں انتہا کو پہنچ گئیں۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کا زمانہ انتہائی عروج کا ہے، ان کے بعد ہی زوال آیا اور بالآخر انگریزوں کی چالبازیوں سے یہ ملک سامراج کی طرف ڈھکیل دیا گیا، مسلمان علماء نے پہلے دن سے انگریزی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور آزادی کا نعرہ لگایا، اس کی ان کو بڑی قیمت چکانی پڑی، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ہزاروں علماء شہید کیے گئے، لیکن آزادی کی چنگاری بجھائی نہ جاسکی اور سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر ملک کو آزاد کرایا، اور ۱۹۴۷ء میں لال قلعہ سے ترنگا لہرایا گیا۔

یہ آزادی چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترک قربانیوں سے حاصل ہوئی تھی، اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی پہلے سے اس ملک میں موجود تھے، اس لیے اس کی بنیاد سیکولرزم پر رکھی گئی اور ایسا قانون بنایا گیا کہ اس میں ہر ایک کو اپنے اپنے مذہب کے موافق عمل کرنے کی اجازت دی گئی۔

کاش کہ ملک ان ہی اصولوں پر چلتا رہتا، جس پر اس کے اولین قائدین اور مجاہدین نے بنیاد رکھی تھی، لیکن افسوس کی بات ہے کہ وہ لوگ جن کا شاید اس ملک کی آزادی کے لیے خون کا کوئی قطرہ بھی نہ بہا ہو، وہ اس ملک کو انتشار کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں اور اس میں ان کے مفادات وابستہ ہیں۔

یہ حالات مسلمانوں کے لیے خاص طور پر تشویش اور فکرمندی کے ہیں، کسی خاص مذہب یا تہذیب کو تھوپنا ملک کے دستور کے بھی خلاف ہے اور مسلمان اس کو کبھی گوارہ بھی نہیں کرسکتے، جن کی اپنی مذہبی شناخت ہے، جو مذہب صرف چند عقائد یا رسومات کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک نظام زندگی ہے جس کی اپنی مکمل تہذیب ہے اور جس کے کسی حصہ سے مسلمان دستبردار نہیں ہوسکتا، اور یہ حق مسلمانوں کو اس ملک کے آئین نے دیا ہے، یہ چھینا نہیں جاسکتا، موجودہ جو حالات ہیں یہ ایک عارضی صورت حال ہے، اس کے لیے یقیناً فکری مندی بھی ضروری ہے اور بیداری بھی، لیکن یہ مایوسی کے حالات نہیں، تاریخ میں بارہا اس سے سخت حالات کا مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی خاک میں دبی چنگاری سے شعلہ جوالہ پیدا کرتا ہے اور پھر ع ''پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے'' جیسے حالات پیدا ہوتے ہیں۔

البتہ فکر وعمل کی ضرورت ہے، اب تک ہم مسلمانوں سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ ہم غیر کے سامنے اسلام کا صحیح نمونہ پیش نہ کرسکے، اس کی صحیح تعلیمات ان کے سامنے نہ لاسکے، سب سے بڑھ کر اس وقت اس کی ضرورت ہے کہ (۱) ہم اپنے ایمان کو تازہ کریں (۲) آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایمان کی فکر کریں، اور اس کے لیے مکاتب اور اسلامک اسکول جابجا قائم کریں (۳) اپنے معاشرہ کو بہتر اسلامی معاشرہ بنائیں (۴) اپنے اسلامی اخلاق سے غیروں کے سامنے صحیح اسلامی نمونہ پیش کریں (۵) ان سے ملاقاتیں کرکے ان کے ذہنوں کو صاف کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو بدگمانیاں پیدا ہوئی ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

ان چند نکات پر اگر محنت ہوگی تو انشاء اللہ پھر سے ایمان کا سورج اس ملک میں جگمگائے گا۔

حج کی سوغات

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

حج کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ کے گھر کی زیارت کے واسطہ حج کرنے کی جو صدا لگائی تھی اور اس وقت جنہوں نے لبیک کہا تھا وہی لوگ آج تک اسی لبیک کہنے کے نتیجہ میں ہر سال دنیا بھر سے حج کرنے جاتے ہیں کیونکہ یہ صدائے ابراہیمی پر لبیک کہنے کا ایک مظہر ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصل ندائے الٰہی تھی جس کو عام کرنے کا حکم حضرت ابراہیم کو دیا گیا، چنانچہ انہوں نے صدا لگائی، یوں بھی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً﴾ (البقرة: ١٢٤) (میں تم کو لوگوں کا مقتدی بناتا ہوں)

یہی وجہ ہے کہ حج کے تمام ارکان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادوں ہی کو تازہ کیا جاتا ہے، جس کو پوری دنیا کے لوگ ایک ہی طریقہ پر انجام دیتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو کسی قوم یا برادری کا مقتدی نہیں بنایا تھا بلکہ تمام انسانوں کا امام بننے کا شرف عطا فرمایا تھا، لیکن اس مقام بلند کے حصول پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے دریافت کیا: کیا میری اولاد میں بھی امامت کا سلسلہ جاری رہے گا؟ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ہاں، مگر ظالمین اس عہد سے مستثنیٰ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حج کے اندر ایک محبت کی چنگاری رکھ دی ہے، کیونکہ اللہ ہی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، اگر یوں دیکھا جائے تو کعبہ صرف ایک سیاہ پوش عمارت ہے، لیکن قدرت الٰہی کا عجیب مظہر ہے کہ اللہ نے اس کو ایسا پر کشش بنا دیا ہے کہ بڑے بڑے پیکر حسن وجمال وہاں جا کر اپنے جمال وکمال کو، اپنے حسن کو یہاں تک کہ خود کو بھول جاتے ہیں، کیونکہ کعبہ ہر ایک کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے اندر خاص کشش رکھی ہے، کیونکہ ساری باتیں نسبت سے ہوتی ہیں، اور کعبہ کی نسبت خدا سے ہے، اس لیے جہاں یہ نسبت آئی تو ایک دم آدمی کہاں سے کہاں پہنچ گیا، اور اس کا مقام اتنا بلند ہوگیا کہ اس تک کوئی پہنچ نہیں سکتا، کوئی گھر اس گھر کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اسی طرح قرآن مجید میں وہی الفاظ ہیں جو ہم اور آپ بولتے ہیں، اور زبان بھی وہی ہے جس میں لوگ بولتے ہیں لیکن چونکہ اس کو اللہ نے اپنا کلام بتایا ہے، اس لیے ایک خاص کشش اور جاذبیت پیدا ہوجاتی ہے، حسن وجمال، رعنائی ودل ربائی ابھر کر آجاتی ہے، اسی طرح یوں تو تمام انسان برابر ہیں لیکن جس کو اللہ نے کہا: میرا نبی، تو وہاں ''میرا'' کہنے ہی سے اس کا مقام بلند ہوگیا، اسی طرح کسی بندہ کو اللہ نے کہا ''میرا ولی'' تو فوراً اس کا مقام بلند ہوگیا، درحقیقت اسی کا نام نسبت ہے اور جب اللہ کی نسبت کسی چیز کو حاصل ہوجاتی ہے تو اس کا مقام بہت بلند ہوجاتا ہے، لہٰذا کعبہ کو بھی یہاں وہی نسبت حاصل ہے۔

کعبہ کے اندر اللہ نے غیر معمولی کرنٹ رکھا ہے، اگر اس کرنٹ سے ہمارا تعلق ہوجائے تو آدمی خود کشاں کشاں حج کی طرف چلا جاتا ہے، اسی لیے وہ لوگ جن کے پاس نہ سامان ہے، نہ اسباب ہیں، لیکن دل بے چین اور بے تاب ہے تو اللہ نے ان سے کہا: میرے گھر آجاؤ، اور ان کے لیے غیب سے ایسا انتظام ہوا کہ وہ وہاں پہنچ گئے اور اللہ نے ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ ان کو اس سے بہت فائدہ ہوا، کیونکہ اللہ نے کعبہ کے اندر ایک خاص کیفیت رکھی ہے جس کو محبت والے ہی جان سکتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کو ہر صاحب حیثیت پر فرض بھی قرار دیا ہے تاکہ ہر شخص اس کی ادائیگی کی طرف متوجہ رہے۔

اللہ تعالیٰ نے حج کا تحفہ پوری امت کو عطا فرمایا ہے، لیکن اب جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے جتنا تعلق ہوگا اور جیسی اس کے اندر محبت ہوگی اللہ اس کو ویسے ہی حج عطا فرمائے گا اور جو محبت میں غرق ہوکر حج کرتا ہے اس کے متعلق فرمایا گیا کہ اگر کوئی مرضیات الٰہی کے مطابق حج کی تکمیل کرتا ہے تو وہ اپنے گھر ایسا واپس ہوگا جیسے اس کی ماں نے اس کو جنا ہو، یعنی وہ آج ہی پیدا ہوا ہو، گویا کہ حج کے ذریعہ سے سارے گناہ ختم ہوجاتے ہیں، اور آدمی بالکل دھلا دھلایا، پاک صاف ہوکر وہاں سے واپس آتا ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حج کی خاص خصوصیت رکھی ہے.....

(باقی صفحہ نمبر ۲۰)

گزشتہ سے پیوستہ

توحید کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

غیب کی کنجیاں:

﴿إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ.....عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾(لقمان: ٣٤)

(یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش کرتا ہے اور رحم کے اندر جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس جگہ اس کی موت ہوگی بلاشبہ اللہ خوب جانتا پوری خبر رکھتا ہے)

قیامت: اس آیت میں پانچ چیزیں بیان کی گئی ہیں، ان کو ''مفاتح الغیب'' کہتے ہیں یعنی یہ غیب کی وہ پانچ چیزیں ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا، ان میں سب سے پہلی چیز قیامت ہے، جس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اور اگر کوئی اس کے متعلق سوال بھی کرے تو اللہ اس سے خوش نہیں ہوتا، قرآن میں اس کی وضاحت ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ ..... لَا يَعْلَمُونَ﴾(الأعراف: ١٨٧)

(وہ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں کہ کب اس کے برپا ہونے کا وقت ہے، کہہ دیجیے اس کا علم تو میرے رب کے پاس ہے، وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کردے گا، آسمانوں اور زمین پر وہ بھاری ہے، اچانک ہی وہ تم پر آجائے گی، وہ آپ سے ایسا پوچھتے ہیں کہ گویا آپ اس کی کرید میں ہیں کہہ دیجیے اس کا پتہ اللہ ہی کو ہے لیکن اکثر لوگ بے خبر ہیں)

اس آیت میں تقریباً پانچ چھ جملے ایسے استعمال کیے گئے ہیں جن میں بار بار یہ تاکید ہے کہ قیامت کا علم سوائے اللہ کے کسی کے پاس نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو اپنے پاس مخفی رکھا ہے، کسی کے لیے اس کو ظاہر نہیں کیا، کوئی بڑے سے بڑا نبی ہو، کوئی فرشتہ ہو، اللہ نے قیامت کو سب سے مخفی رکھا ہے، البتہ علامات قیامت بیان فرمائی ہیں، لیکن علامات بھی دو طرح کی ہیں، بعض قریبی علامات ہیں اور بعض عام علامات ہیں، تو جو عام علامات ہیں وہ تو ایسی ہیں کہ سینکڑوں ہزاروں سال پہلے ان کا آغاز ہوسکتا ہے، مثلاً: آپ ﷺ نے اپنی بعثت کو قیامت کی علامت قرار دیا، فرمایا کہ میں آگیا اور میں آخری نبی ہوں، اب میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اب میرے بعد قیامت آئے گی، گویا یہ بھی ایک علامات قیامت میں سے ہے، اس کے علاوہ بہت سی قریبی علامات آپ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ جب وہ آجائیں گی تو گویا جب قیامت کا بالکل قرب ہوگا، تب وہ علامات ظاہر ہوں گی، جیسے دجال کا نکلنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اترنا اور آخری علامت سورج کا مشرق کے بجائے مغرب سے نکلنا ہے، جس کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا، تو یہ قریب کی علامت ہے، اور جو بعید کی علامات ہیں ان سے بھی کوئی قیامت کا تعین نہیں کرسکتا کہ قیامت کب آئے گی، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو چھپایا ہے، اور اس لیے چھپایا ہے کہ یہ امتحان کا دن ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسانوں کو اس مقصد سے بھیجا ہے کہ وہ دیکھے کہ لوگ کیسے اعمال کرتے ہیں، اب ان اعمال کا جو بدلہ ملنا ہے، اس دن کو اللہ نے چھپا رکھا ہے، اس لیے کہ اگر چیز متعین ہوجاتی تو اس کی نوعیت بدل جاتی، امتحان کی چیزیں عام طور پر مخفی ہوتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کو بھی چھپا رکھا ہے تاکہ لوگ اس کی تیاری کریں، چنانچہ جب جس کی موت آئے گی، وہ یہ سمجھے کہ گویا اس کی قیامت آگئی، اور اگر کوئی زندہ رہا اور قیامت اس پر آگئی تو اس کا معاملہ اس کے ساتھ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے تمام بندوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں گے، بندوں نے جیسے اعمال کیے ہوں گے، اسی کے اعتبار سے اللہ کے یہاں اس کا صلہ دیا جائے گا۔

بارش: مذکورہ آیت میں دوسری چیز فرمائی گئی: ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ یعنی وہی بارش اتارتا ہے اور وہی یہ بھی جانتا ہے کہ بارش کب ہوگی، بارش نازل کرنے کا جو عمل ہے، یہ ایسا ہے کہ اس سلسلہ میں دنیا نے بہت کوشش کی، جہاں سوکھا ہوتا ہے، بارشیں کم ہوتی ہیں تو جو بڑی ترقی یافتہ قومیں ہیں، انہوں نے بہت کوششیں کیں کہ کسی صورت سے بھی بارش ہوجائے، ان کو کچھ کامیابی تو ملی لیکن اس میں اتنی لمبی رقم خرچ ہوئی کہ خرچ کا دس فیصد بھی حاصل نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ اس بارش سے جس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہو کچھ حاصل ہونے والا نہیں، غرض کہ باہر ملکوں نے کچھ بارش کرنے کی

شکل پیدا کی، بھاپ پیدا کی، کچھ گیسیں جمع کیں، اور نہ جانے کیا کچھ کیا، اس پر اتنا خرچ ہوا اور اس کے بعد بارش بہت معمولی ہوئی، کچھ قطرے گرے اور اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا، اس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ بارش کا نظام محض اللہ کی قدرت میں ہے، وہ جب چاہتا ہے بارش نازل فرماتا ہے، جہاں چاہتا ہے نازل فرماتا ہے اور کب بارش ہوگی یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے علم میں ہے، آج کل محکمہ موسمیات والے پیشین گوئی کرتے رہتے ہیں، لیکن عام طور پر اس کا الٹا ہی ہوتا ہے، کبھی انہوں نے کہا کہ بارش کم ہوگی تو بہت ہوتی ہے، یہاں تک کہ تباہی تک آجاتی ہے، درحقیقت ان کا ایک اندازہ ہوتا ہے جو ہواؤں کی رفتار سے وہ طے کرتے ہیں، ہواؤں کی جو رفتار ہے اس کو باقاعدہ آلات کے ذریعہ ناپ کر یہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اتنے وقت پر فلاں جگہ یہ بادل پہنچیں گے، یہ بادل برسنے والے ہیں تو امید ہے کہ فلاں جگہ بارش ہوگی، لہٰذا کبھی اللہ چاہتے ہیں تو وہیں کرتے ہیں، اور اگر نہیں چاہتے تو نہیں کرتے۔

غرض کہ یہ چیز بھی ایسی ہے جو کوئی نہیں جانتا، اور یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے، فرعون کے زمانہ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ سوکھا پڑا، چنانچہ اس کے حالی موالی سب جمع ہوئے اور کہا کہ آپ تو خدا ہیں، بارش نازل کردیجئے، بہت پریشانی ہے، اب اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لہٰذا اس نے اپنے ان جنات کو بلایا جو شیاطین کی صفت رکھتے تھے، اور کہا کہ بڑی مصیبت پڑ گئی ہے، تم لوگ کوئی تدبیر کرو کہ بارش ہوجائے، انہوں نے کہا: کیا مشکل ہے، رات کو اپنے کارندوں کو بھیج دیا، انہوں نے فضا پر جا کر پیشاب کیا تو بارش کیا ہوئی ایک آفت آگئی۔

رحم مادر: مذکورہ آیت میں تیسری چیز بیان فرمائی: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ یعنی ماؤں کے پیٹ میں کیا ہے وہی جانتا ہے، کوئی نہیں جانتا ہے، اب کوئی کہے کہ اب تو الٹرا ساؤنڈ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ کیا ہے، بچہ ہے بچی ہے، ناقص ہے کامل ہے، لیکن ظاہری بات ہے کہ وہ الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہوتا ہے، یعنی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے، اگر کوئی بغیر دیکھے بتائے تو یہ غیب ہے اور جب دیکھ کر بتا رہا ہے تو غیب کہاں ہے؟ وہ تو سامنے کی چیز ہے، سامنے کی چیز کوئی بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ صرف یہی بتا سکتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی ہے، ناقص ہے یا کامل ہے، لیکن کس چیز میں ناقص وکامل ہے؟ یہ نہیں معلوم، اخلاق میں کیسا ہے اور اس کا دماغ کیسا ہوگا؟ وہ کس کیفیت کے ساتھ پیدا ہوگا؟ یہ ساری چیزیں اللہ ہی جانتا ہے، کوئی نہیں جانتا، کوئی ڈاکٹر سے پوچھے کہ دماغ اس کا ٹھیک ہے یا نہیں؟ حافظہ مضبوط ہے یا کمزور ہے یا اور کیا ہے؟ یہ ساری جو اندر کی تفصیلات ہیں یہ الٹرا ساؤنڈ کے بعد بھی معلوم نہیں ہوتیں، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، یہ سب کوئی نہیں جانتا، اور جو ظاہری چیزیں بتائی جاتی ہیں، یہ دیکھ کر بتائی جاتی ہیں، جس کا تعلق غیب سے نہیں ہے۔

کل کا علم: چوتھی چیز فرمائی گئی: ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ یعنی کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اس چیز کا تو سب ہی کو تجربہ ہے، بسا اوقات آدمی بڑے بڑے ارادے کرتا ہے، لیکن جو وہ سوچتا ہے اس کے بالکل خلاف ہوتا ہے، ہر شخص اپنی زندگی میں دیکھے تو اس طرح کی ایک دو نہیں، دسیوں بیسیوں مثالیں ملیں گی، حضرت علیؓ کا جملہ بہت مشہور ہے: میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے جانا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آدمی کیسے کیسے ارادے کرتا ہے کہ یہ کریں گے، یہ کریں گے، لیکن ایسے ایسے موانع پیش آجاتے ہیں، جس کا تصور بھی نہیں ہوتا، آدمی سوچتا بھی نہیں کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، لیکن اللہ کا حکم ہے کہ جب اللہ چاہتا ہے تو سب ہوتا چلا جاتا ہے، انسان جتنے ارادے کرتا ہے، وہ سب ہوتے چلے جاتے ہیں، لیکن اگر اللہ کا فیصلہ نہ ہو تو بے شمار رکاوٹیں کھڑی ہوجاتی ہیں، ایسی رکاوٹیں کہ دور کرنا چاہے تو نہ کرسکے، تو یہ چیز ایسی ہے کہ کل کے بارے میں آدمی کیا کرے گا کوئی نہیں جانتا، آدمی اپنے طور پر فیصلے کرتا ہے، ارادے کرتا ہے، پلاننگ کرتا ہے، لیکن اللہ کے ایسے فیصلے ہوتے ہیں کہ ساری پلاننگ دھری رہ جاتی ہے، ملکوں کے پیمانوں پر بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، جماعتوں کے پیمانوں پر بھی مثالیں موجود ہیں، افراد کے پیمانے پر بھی موجود ہیں۔

موت کا علم: پانچویں بات فرمائی: ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ یعنی کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی، یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے کہ آدمی کیا کیا تمنائیں کرتا ہے، لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کا حکم ہوتا ہے اور اس کی کوئی تدبیر نہیں چلتی۔

گذشتہ سے پیوستہ

سجدہ سہو کے احکام ومسائل

مفتی راشد حسین ندوی

سجدۂ سہو کب تک کرسکتا ہے؟ اگر کسی شخص پر سجدۂ سہو کرنا واجب تھا، لیکن اسے یاد نہ رہا اور اس نے بھولے سے سلام پھیر دیا، تو جب تک کوئی نماز کے منافی عمل نہ کردے، مثلاً: کسی سے بات چیت، قبلہ سے سینہ پھیرنا وغیرہ تو یاد آجانے پر حکم یہ ہے کہ سجدۂ سہو کرکے نماز مکمل کرلے۔ (شامی:۱/۵۵۵)

اسی طرح اگر کسی نے مثلاً چار رکعت والی نماز میں دو ہی رکعت پر اس گمان سے سلام پھیر دیا کہ چار رکعت پوری کرچکا ہے، پھر یاد آگیا تو اب وہ چار رکعات پوری کرلے اور اخیر میں سجدۂ سہو کرلے، نماز ہوجائے گی۔ (شامی:۱/۵۵۶)

وتر میں دعاء قنوت کا ترک کردینا: وتر کی نماز میں دعاء قنوت واجبات میں سے ہے، لہٰذا اگر اس کو بھولے سے چھوڑ دیا تو سجدۂ سہو کرنا ہوگا اور اگر دعاء قنوت چھوڑ کر رکوع میں چلا گیا، پھر یاد آیا کہ دعاء قنوت نہیں پڑھا ہے تو حکم یہ ہے کہ رکوع میں دعاء قنوت نہ پڑھے، نہ ہی دوبارہ قیام کی طرف لوٹ کر دعاء قنوت پڑھے بلکہ اس کی تلافی اخیر میں سجدۂ سہو سے کرلے، لیکن اگر رکوع میں یاد آنے کے بعد قیام کی طرف لوٹ گیا اور دعاء قنوت پڑھ لی تب بھی صحیح قول کے مطابق نماز فاسد نہیں ہوگی (اگرچہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا) لیکن سجدۂ سہو اس صورت میں بھی کرنا ضروری ہوگا۔ (شامی:۱/۴۹۵، ہندیہ:۱/۱۳۸)

نوافل اور عیدین میں سہو: اگر نوافل میں بھی واجبات میں سے کوئی چیز چھوٹ جائے تو اس میں بھی سجدۂ سہو لازم ہوگا، اصلاً یہی حکم عیدین اور جمعہ کی نماز کا بھی ہے، چنانچہ اگر جمعہ اور عیدین میں کوئی واجب چھوٹ جائے تو اصلاً سجدۂ سہو لازم ہے، لیکن متاخرین نے صحیح اس کو قرار دیا ہے کہ اگر مجمع زیادہ ہو اور انتشار کا اندیشہ ہو تو سجدۂ سہو ترک کیا جاسکتا ہے، اگر مجمع زیادہ نہ ہو تو سجدۂ سہو عیدین اور جمعہ میں بھی واجب رہے گا، اور مجمع اگر کسی عام نماز میں بھی بہت ہو اور انتشار کا اندیشہ ہو تو اس میں بھی سجدۂ سہو چھوڑ دینے کی اجازت ہے، یہ بھی خیال رہے کہ عیدین میں چھ تکبیریں بھی واجبات میں سے ہیں، لہٰذا مجمع زیادہ نہ ہو تو بھولے سے ان کے چھوڑنے پر سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ (شامی:۱/۵۵۶، ہندیہ:۱/۱۳۸)

رکعات میں شک کا مسئلہ: اگر کسی شخص کو عام طور سے شک نہیں ہوتا لیکن شاذ ونادر کبھی شک ہوجاتا ہے تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ پھر سے نماز پڑھے اور جس نماز میں شک ہوگیا تھا اس کو توڑ دے۔ (شامی:۱/۵۵۶، ہدایہ مع الفتح:۱/۱۵۲) اس لیے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کسی کو پتہ نہ چلے کہ تین رکعات پڑھیں یا چار پڑھیں تو وہ اعادہ کرلے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ) ہمارے علماء نے اس حدیث کو ایسے شخص پر محمول کیا ہے جس کو عام طور سے شک نہیں ہوتا۔

اور اگر کسی شخص کو بار بار شک ہوجاتا ہے تو بار بار نماز دہرانے سے اس کو پریشانی ہوجائے گی، اس لیے شریعت نے آسانی کے لیے اس کے لیے یہ راستہ نکالا کہ اگر اس طرح کی صورت حال ہے تو غور کرلیا جائے، اگر کسی ایک طرف غلبہ ظن ہو، مثلاً: شک ہوگیا کہ تین رکعات ہوئیں یا چار ہوئیں اور غلبہ ظن یہ ہے کہ چار ہوئی ہیں تو چار ہی مان لے گا، اور اس صورت میں سجدۂ سہو کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، الا یہ کہ غلبہ ظن حاصل کرنے میں ایک رکن کی ادائیگی کے بقدر سوچتا رہ گیا ہو تو سجدۂ سہو لازم ہوجائے گا۔

(شامی:۱/۵۵۷، ہدایہ مع الفتح:۱/۴۵۲، ہندیہ:۱/۱۳۰)

اس طرح کی صورت حال کے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے کہ ”جب تم میں سے کسی کو شک ہوجائے تو صواب کی تحری کرے یعنی اصلاً کتنی رکعات ہوئی ہیں اس پر غور کرے“۔ (بخاری ومسلم)

اور اگر کسی طرف غلبہ ظن بھی نہ رہا ہو تو جتنی رکعات پڑھنے کا یقین ہو اسی کو اصل مان لے، مثلاً: شک ہے کہ دو پڑھی ہیں یا تین تو دو مان لے، اس لیے کہ دو رکعات کا ہونا یقینی ہے، پھر آگے ہر رکعت میں قعدہ کرلے، اور اخیر میں سجدۂ سہو کرلے۔

(ہدایہ مع الفتح:۱/۴۵۳، ہندیہ:۱/۱۳۰، شامی:۱/۵۵۷)

اس صورت کے بارے میں حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میں سے کسی سے نماز میں بھول ہوجائے اور پتہ نہ چلے کہ ایک رکعت پڑھی ہے یا دو رکعات تو وہ ایک پر بناء کرے، اور اگر پتہ نہ چلے کہ دو پڑھی ہیں یا تین تو دو پر بناء کرے اور اگر پتہ نہ چلے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو تین پر بناء کرے اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرلے۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

وتر کی رکعات میں شک: اگر وتر کی نماز پڑھتے ہوئے شک ہوجائے کہ دوسری رکعت ہے یا تیسری رکعت ہے تو اسے چاہیے کہ اسے دوسری ہی قرار دے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، بس فرق یہ ہے کہ اس رکعت کو دوسری ماننے کے باوجود اس میں دعاء قنوت پڑھے گا، پھر رکعت مکمل کرنے کے بعد قعدہ کرکے جب اگلی رکعت کے لیے کھڑا ہوگا تو اس میں بھی دعاء قنوت پڑھے گا اور اخیر میں سجدۂ سہو کرے گا۔ (شامی: ۱/۵۵۱)

امام اور مقتدیوں کا اختلاف: سلام پھیرنے کے بعد امام اور مقتدیوں میں رکعات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہوگیا تو اس کی چار صورتیں ہیں:

۱- امام جو کچھ کہہ رہا ہے اگر اس کو اس پر مکمل یقین ہے تو اس کو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲- اگر کچھ مقتدی امام کے ساتھ ہوں اور کچھ اختلاف کر رہے ہوں تو اس صورت میں بھی امام کی رائے پر عمل ہوگا یعنی اعادہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

۳- اگر رکعات کے سلسلہ میں امام کو خود شک ہوجائے اور مقتدی کہیں کہ رکعات میں کمی رہ گئی ہے تو مقتدیوں کی بات پر عمل کیا جائے گا اور نماز دہرائی جائے گی۔

۴- امام کو یقین ہے کہ نماز میں کمی رہ گئی تو اعادہ لازم ہے، لیکن اگر کسی کو یقین ہو کہ نماز مکمل ہوگئی تو اس کو اجازت ہے کہ اعادہ والی نماز میں شریک نہ ہو۔ (شامی: ۱/۵۵۸)

سجدۂ تلاوت کے احکام ومسائل

قرآن مجید میں چودہ جگہیں ایسی ہیں جن کی تلاوت کرنے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے، آیت میں اس جگہ نشان لگادیا جاتا ہے جس کی تلاوت سے سجدہ واجب ہوجاتا ہے، اس لیے ان آیات کا ذکر ہم چھوڑ کر سجدۂ تلاوت کے بقیہ احکام کا ذکر کررہے ہیں:

سجدۂ تلاوت کب واجب ہوتا ہے: تین چیزوں میں سے کسی کے بھی پیش آنے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوجاتا ہے:

۱- خود آیت سجدہ کی تلاوت کرے۔ ۲- کسی سے آیت سجدہ سنے۔ ۳- امام کی اقتداء کررہا ہو اور وہ سجدۂ تلاوت کرے، خواہ مقتدی نے آیت سجدہ نہ سنی ہو یا تلاوت کے وقت موجود ہی نہ رہا ہو۔ (شامی: ۱/۵۶۵)

سجدۂ تلاوت کی شرائط: سجدۂ تلاوت انہیں لوگوں پر واجب ہوتا ہے جن پر نماز فرض ہوتی ہے یعنی مسلمان، عاقل، بالغ اور حیض ونفاس سے پاک پر سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے، کافر، مجنون، بچہ نیز حیض و نفاس میں مبتلا عورت پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، نہ خود تلاوت کرنے سے نہ کسی سے آیت سجدہ سننے سے۔

اسی طرح سجدۂ تلاوت کے لیے بھی وہ تمام امور شرط ہیں جو نماز کے لیے شرط ہیں، چنانچہ سجدۂ تلاوت اسی وقت صحیح ہوگا جب سجدہ کرنے والا پاک اور باوضو ہو، جگہ پاک ہو، قبلہ رخ ہوکے کیا جارہا ہو وغیرہ۔ البتہ سجدۂ تلاوت کے لیے تکبیر تحریمہ کرنا یا ہر آیت سجدہ کے لیے الگ سے متعین کرنے کی نیت کرنا شرط نہیں ہے۔ (شامی: ۱/۵۶۷-۵۶۸، ہندیہ: ۱/۱۳۲)

سجدۂ تلاوت تبھی واجب ہوتا ہے جب آیت سجدہ کو مکمل طور سے پڑھے، اگر آیت سے ایک لفظ بھی باقی رہ گیا تو سجدہ واجب نہیں ہوگا، بلکہ اگر بعد والی آیت کا بھی آیت سجدہ سے تعلق ہو تو ان دونوں آیتوں کی تلاوت کرنے ہی پر سجدہ واجب ہوگا، اسی طرح اگر پوری آیت پڑھ لی لیکن سجدہ والا لفظ نہ پڑھا تب بھی سجدہ واجب نہیں ہوگا۔ (شامی: ۱/۵۶۵، احسن الفتاوی: ۴/۶۲-۶۳) (باقی صفحہ ۱۳ پر)

گذشتہ سے پیوستہ

فراعنۂ مصر-تاریخ کے آئینہ میں

عبدالسبحان ناخدا ندوی

مؤرخین کے نزدیک یہی فرعون ''فرعون اعظم'' تھا، شاید اللہ تعالیٰ اس قوم کے ذریعہ اسے ہلاک کرنا چاہا جسے درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا، تاکہ متکبرین وطغاۃ کے سامنے یہ سبق ہمیشہ رہے کہ اللہ اگر چاہے تو انتہائی معمولی لوگوں سے بھی بڑی بڑی طاقتوں کا خاتمہ کرسکتا ہے، قرآن کریم فرعون کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتا ہے:

﴿مِن فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ﴾(الدخان: ۳۱) (وہ بہت بڑا بن گیا اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں تھا) ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ﴾(القصص: ٤) (فرعون زمین میں چڑھنے لگا ہے) ﴿إِنَّهُ طَغَى﴾(طه: ٢٤) (وہ سرکش بن گیا) ﴿إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾(القصص: ٢٨) (وہ فساد برپا کرنے والوں میں تھا) ﴿وَفِرْعَوْنَ ذُو الْأَوْتَادِ﴾(ص: ١٢) (میخوں والا فرعون) ﴿وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ﴾(یونس: ٨٣) (فرعون تو زمین میں بہت اوپر اٹھا ہوا تھا)

رمسیس ثانی کے تعلق سے جو بھی معلومات ملتی ہیں، ان کی روشنی میں اس کا فرعون ہونا قرین قیاس لگتا ہے، دوسرا قول منفتاح کے بارے میں ملتا ہے، اسے بعض حضرات مفسرین فرعون موسی بتاتے ہیں، یہ رمسیس ثانی کا بیٹا تھا، یہ ۱۲۲۴/قبل مسیح میں بادشاہ بنا اور تاریخ کے مطابق اپنے باپ کے نقش قدم پر رہا، چونکہ شاہان مصر کی پوری تاریخ میں بنی اسرائیل کا ذکر منفتاح کی زبانی ملتا ہے، وہ بھی نفرت بھرے انداز میں، اس لیے بعض مفسرین اور مؤرخین اس طرف گئے ہیں کہ یہی فرعون موسی تھا، منفتاح کہتا ہے: اسرائیل اجڑ گیا، اب بنی اسرائیل کا وجود نہیں رہا۔ (قصة الحضارة: ٢/ ٣٢٤)

ہر انتقام کی آگ میں جلنے والے کو منفتاح نے قید کرلیا۔ (۲/۳۲۴)

اسی طرح تاریخ مصر یہ بھی بتاتی ہے کہ منفتاح کے دور کے بعد مصر کے اندرونی حالات زبردست انتشار کا شکار رہے، اس کی بنیاد پر ذہن اس طرف جاتا ہے کہ شاید یہی فرعون موسی ہو۔

(الشرق الأدنى القديم فى مصر: ١/ ٢٣٦)

یہ دوسری رائے ہے، ہم نے پہلی رائے کو اس لیے ترجیح دی کہ قرآن جس فرعون کے کرّ وفر کا ذکر کرتا ہے وہ منفتاح سے بڑھ کر رمسیس ثانی سے مطابقت رکھتا ہے، ایک تاریخی اشکال ان باپ بیٹے کو فرعون ماننے کی صورت میں یہ پیش آتا ہے کہ تاریخ کے لحاظ سے حضرت موسی کا زمانہ ۱۵۰۰/قبل مسیح بتایا جاتا ہے، جب کہ ان بادشاہوں کا زمانہ ۱۲۹۰/قبل مسیح بتایا گیا ہے، اس کا جواب آسان ہے کہ مؤرخین شاہان مصر کی تاریخ کے تعلق سے یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی تاریخوں میں چند صدیوں کا فرق واقع ہوسکتا ہے، ویسے بھی یہ ایک تخمینی تاریخ ہے، جس کا ہو بہو تقویم کے مطابق ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ فرعون موسی ''تحوتمس'' ثالث ہے، جو مشہور اٹھارویں خاندان کا غالباً سب سے طاقتور فرعون تھا، اسے عظیم جنگجو قرار دیا جاتا ہے، بعض آثار قدیمہ کے ماہرین یہ بتاتے ہیں کہ ''اریحا'' کے شاہی مقبروں کے آثار سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو رہائی دلانے میں شہزادی ''حاتشبوت'' کا ہاتھ تھا جو بعد میں ملکہ بھی بنی، حضرت موسی کی پرورش بھی اسی شہزادی نے شاہی گھرانے میں کی تھی، جب اس شہزادی کا کٹر دشمن تحوتمس ثالث مملکت مصر کا بادشاہ بنا تو حضرت موسی و بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا، اور حضرت موسی بنی اسرائیل کو لے کر سمندر پار وادی سینا تشریف لے گئے، یہ واقعہ ۱۴۴۷/قبل مسیح کا ہے، ان مقبروں کے ذریعہ جو مزید معلومات ملیں اس سے حضرت یوشع کے ذریعہ اریحا کو فتح کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے، یہ ۱۴۰۰/قبل مسیح کی بات ہے، اس کا تذکرہ توریت میں موجود ہے، اس رائے پر اشکال یہ ہے کہ تاریخ کے لحاظ سے تحوتمس ثالث کی وفات ۱۴۳۶/قبل مسیح کی ہے، جب کہ فرعون موسی تو غرق ہوکر مرا، بہرحال یہ رائے بھی غور وفکر کا میدان رکھتی ہے۔ (قصة الحضارة: ٢/ ٣٢٦-حاشية)

فرعون موسی کون ہے؟ بنی اسرائیل کس کے عہد میں مصر سے نکلے؟ اس بارے میں مؤرخین کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہیں، عام رائے یہی ہے کہ یہ واقعہ فراعنہ کے اٹھارویں یا انیسویں خاندان کے دور حکومت میں پیش آیا، اٹھارویں خاندان کا مشہور فرعون تحوتمس ثالث

ہے، بعض مؤرخین اسے فرعون موسی خیال کرتے ہیں، اس کا دور حکومت ۱۴۶۸ قبل مسیح سے ۱۴۳۶ قبل مسیح تک رہا، یہ اولین فرعون تھا جس نے سوریا کو شکست دی، اور مغربی ایشیاء کے مختلف علاقوں پر قبضہ کیا اور سب کو اپنا باج گزار بنایا، اس نے فراعنہ مصر میں سب سے پہلے سمندر کی اہمیت جانی اور ایک عظیم بحری بیڑا تیار کیا، مشرق ادنی کے بھی بعض علاقہ اس کی زیر سلطنت آئے، صرف سرزمین شام سے اسے جو خراج ملتا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بسا اوقات قومی خزانے میں شام سے حاصل کردہ خراج نو ہزار رطل سونے چاندی کے ذخائر پر مشتمل ہوتا تھا (نو ہزار رطل تقریبا ساڑھے چار ہزار کلو بنتے ہیں) ایشیاء کے علاقوں میں اس کے حملے مسلسل جاری رہے اور ہر دفعہ کامیابی اسی کو حاصل ہوتی رہی، یہ مہم جو اور خطر پسند بادشاہ مشہور ہوا، اسے بعض مؤرخین انصاف پسند بادشاہ قرار دیتے ہیں، تحوتمس ثالث کو فرعون موسی قرار دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم فرعون کو جس طاقتور بادشاہ کے روپ میں پیش کرتا ہے، تحوتمس ثالث تاریخی لحاظ سے اسی سطح کا طاقتور بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن یہ وجہ اس لیے کافی نہیں کہ فراعنہ کی تاریخ میں ایسے متعدد فراعنہ گذرے ہیں جو بڑی زبردست طاقت کے مالک تھے، اور قرآن کریم کے بیان کردہ فرعون سے بہت حد تک مشابہت رکھتے ہیں، خود تحوتمس ثالث کا بیٹا امحوتب ثانی نہایت طاقتور بادشاہ تھا، یہی معاملہ رمسیس ثانی اور اس کے بیٹے منفتاح کا بھی ہے، تحوتمس کو فرعون موسی قرار دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اریحا کے شاہی قبروں کو کھولا گیا تو وہاں سے یہ معلومات فراہم ہوئیں کہ حضرت موسی کو شہزادی حتشبوت نے اپنی پناہ میں لیا، اور آپ نے شاہی گھرانے میں اسی شہزادی کی گود میں پرورش پائی، جب تخت شاہی پر اس شہزادی کا کٹر دشمن تحوتمس ثالث بیٹھا تو آپ کو مصر چھوڑ کر جانا پڑا، ان قبروں سے جو مزید معلومات ملیں اس سے اریحا کے حضرت یوشع علیہ السلام کے ہاتھوں فتح ہونے کی بات بھی ثابت ہوتی ہے، جس کا تذکرہ توریت کی کتاب یشوع میں ملتا ہے، یہ معلومات اگر واقعی صحیح ہیں تو تحوتمس ثالث کے فرعون موسی ہونے کی دلیل بن سکتی ہیں، لیکن سب سے بڑا اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے فرعون کی ہلاکت کے بعد اس کی سلطنت ختم ہوگئی، اس کے وارث دوسرے لوگ بنے، ﴿كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ﴾ یا ﴿فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا﴾ (ہم نے ان کو گئے گذرے بنادیا) یا ﴿فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ ﴿فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ جَمِيعًا﴾ ﴿وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ﴾ ان آیات سے یہ اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب یہ فرعون ہلاک ہوا تو اس کے خاندان کی سلطنت بھی ختم ہوگئی، جب کہ تاریخ کے حوالوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تحوتمس ثالث کے بعد حکومت اس کے بیٹے امحوتب ثانی کو ملی، پھر یہ سلسلہ اس کے خاندان میں چلا، اس سے کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ تحوتمس ثالث اپنے خاندان کا آخری فرعون نہیں تھا، اس بنیاد پر اسے فرعون موسی ماننا مشکل ہے۔

امحوتب ثانی یہ تحوتمس ثالث کا بیٹا ہے، بعض مؤرخین اسے فرعون موسی خیال کرتے ہیں، اس کے عہد میں مصری فوجی طاقت اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی، مصری سلطنت کے حدود اور وسیع ہوئے، خاص طور پر جنوب مصر میں یہ اور آگے بڑھتا چلا گیا، اس کا دور حکومت ۲۶/ سال رہا، یہ نہایت سخت دل بادشاہ تھا، اس کے فرعون موسی ہونے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی، رمسیس ثانی کے بارے میں تفصیلاً لکھا جاچکا ہے، اسے فرعون موسی قرار دینے کی وجوہات بھی کچھ بیان ہوئی ہیں، لیکن یہاں بھی وہی سوال قائم ہوتا ہے کہ اس کے بعد حکومت اس کے بیٹے مرنبتاح یا منفتاح کو ملی، یعنی یہ اپنے عہد کا آخری فرعون نہیں تھا، جب کہ قرآن کریم سے فرعون موسی اپنے عہد و خاندان کا آخری فرعون معلوم ہوتا ہے، اس لیے رمسیس کو بھی فرعون ماننے میں دشواریاں پیش آتی ہیں، ہاں حضرت موسی کے دور کو دو فرعونوں کا مشترک دور قرار دیا جائے تو اسے اول دور کا فرعون ماننے میں کوئی بڑا اشکال پیدا نہیں ہوتا، ایک طبقہ رمسیس ثانی کے بیٹے منفتاح (مرنبتاح) کو فرعون موسی قرار دیتا ہے، تاریخ اسے عالی ہمت بادشاہ قرار دیتی ہے، غیر ملکی شورشوں کو دفع کرنے میں یہ نہایت سخت گیر واقع ہوا تھا، اس سے متعلق جو تختیاں برآمد ہوئی ہیں ان میں اسرائیل کا نام ہے، اس سے متعلق ایک تختی کی عبارت کچھ یوں ہے: سارے بادشاہ مغلوب ہوئے اور سب نے کہا سلام، تحنو برباد ہوا، حتیوں کی زمین پرسکون ہوئی (یعنی دب گئی) کنعان نے سر اٹھایا، ہر طرح کی مصیبتیں اس پر ٹوٹ پڑیں، اسرائیل اجڑ گیا اور اسرائیل کے بیٹوں کا کوئی وجود باقی نہ رہا، فلسطین کی زمین مصر کی بیوہ بنی، تمام

علاقے سمٹ گئے اور دب گئے، جو کوئی انتقام کا پیاسا تھا، بادشاہ منفتاح نے سب کو جکڑ دیا۔ یہ عبارت اگر اسی کی ہے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت سخت گیر جابر حکمراں تھا، اور قرآن کریم جس طاقتور فرعون کا تذکرہ کرتا ہے اس کی حیثیت کچھ ایسی ہی تھی، جس طرح ملکوں کی مغلوبیت کا یہ تذکرہ کر رہا ہے اس سے ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ یا ﴿الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ☆ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ﴾ کا منظر سامنے آتا ہے، اسے فرعون موسی قرار دینے کی ایک طاقتور وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اس کے عہد کے بعد انیسویں خاندان کے عہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بس بعض بادشاہوں کے نام اور ان کی حکومت کا نہایت سرسری تذکرہ ملتا ہے، جو شکوک و شبہات سے خالی نہیں، بلکہ عام مؤرخین یہ پتہ لگانے میں ناکام نظر آتے ہیں کہ آخر اس خاندان کی حکومت کیسے ختم ہوئی، اور اس کے ختم ہونے کے کیا اسباب تھے، تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انیسویں خاندان کا دورِ حکومت جیسے ہی ختم ہوا، ملک مصر کے طول و عرض میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں، خاص طور پر شامی الاصل ''ارسو'' نامی شخص کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے، جس نے مملکت مصر پر قبضہ کیا، اور ملک کا حاکم بن بیٹھا، منفتاح کو فرعون موسی قرار دینے سے قرآنی بیان اور تاریخ میں مطابقت زیادہ نظر آتی ہے، جس طرح تاریخ یہ بتاتی ہے کہ منفتاح کے خاتمہ پر انیسویں عہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور مملکت مصر ایک اور خاندان کے حوالہ ہو جاتی ہے، اسی طرح قرآن کریم بھی اس کا ذکر کرتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد ایک دوسری قوم ان کی جگہ آئی، اور فرعون کا پورا عہد ختم ہو گیا، ارشاد ہے: ﴿كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ☆ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ☆ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ☆ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ﴾ (کتنے باغات اور چشمے، کتنی کھیتیاں اور عمدہ ٹھکانے یہ چھوڑ گئے، اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو اس کا وارث بنایا) ''وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ'' سے کم از کم اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ فرعون موسی کے خاتمہ کے بعد پھر اس خاندان کا کوئی شخص بادشاہ نہ بن سکا، ایک اور مقام پر قرآن کا بیان یہ ہے: ﴿فَلَمَّا آسَفُونَا انتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ☆ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ﴾ (جب آل فرعون نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو قصہ پارینہ اور دوسروں کے لیے نشان عبرت بنا دیا) ''سلفا'' کے لفظ سے بھی ان کے پورے عہد کے خاتمہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، منفتاح کو فرعون موسی ماننے پر یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ اس کا دور حکومت صرف آٹھ سال پر مشتمل تھا، جب کہ قرآن کریم جس فرعون کا ذکر کرتا ہے اس کا دور حکومت حضرت موسی کی پیدائش سے لے کر آپ کی ہجرت تک کم از کم معلوم ہوتا ہے، جو ظاہر بات ہے کہ کم از کم چالیس پچاس سال پر محیط ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو تاریخ کا بیان قطعی صداقت پر مبنی نہیں ہوتا ہے، بالخصوص قدیم تاریخ میں تو حکومت کی مدت میں کمی بیشی کا بہت زیادہ امکان رہتا ہے، اس لیے یہ کوئی وزنی دلیل نہیں ہے، یہ بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام کے دور کو ایک ہی فرعون کا دور ماننا آخر کیوں ضروری ہے؟ ممکن ہے کہ حضرت موسی کا ابتدائی طویل دور رمسیس ثانی کا رہا ہو اور آخری مختصر دور اس کے بیٹے منفتاح کا رہا ہو، بعض موجودہ مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، بہر حال فرعون موسی کا تاریخی تناظر میں جائزہ لیا جائے تو منفتاح سب سے زیادہ فرعون موسی ہونے کے لائق نظر آتا ہے۔

یہ بات اگر تسلیم کی جائے تو فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل کو مصر کی حکومت ملی، کم از کم کچھ مدت کے لیے تو ضرور ملی، جس کی طرف بعض مفسرین گئے ہیں اور قرآن کریم کے بیانات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، تو پھر ''اِرسو'' جسے شامی غاصب بتایا جاتا ہے وہ آخر کوئی اسرائیلی فرد کیوں نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اسرائیلی بھی ایک لحاظ سے شامی ہی تھے، اس لیے ''ارسو'' کو اسرائیلی قرار دینے میں کوئی مانع نظر نہیں آتا، چونکہ مؤرخین کو فرعونی عظمت و جلال کو ہر حالت میں ظاہر کرنا تھا، اس لیے بہت ممکن ہے کہ اسرائیلی اقتدار کو اجنبی و غاصب اقتدار دکھایا گیا ہو، اور فرعون کے مع لاؤ لشکر ڈوب جانے کے حیرت انگیز واقعہ کو تاریخ کے صفحات ہی سے ہٹا دیا گیا ہو، تاکہ فرعون کی فرعونی عظمت میں کوئی فرق نہ آئے، بہر حال قرآن کریم فرعون کا جو انجام بتاتا ہے اور منفتاح کے انجام کے بعد تاریخی لحاظ سے مصر کی جو تصویر دکھائی دیتی ہے ان میں ربط قائم کرنا آسان نظر آتا ہے، اس لیے منفتاح کو فرعون موسی قرار دینے کی ایک معقول وجہ نظر آتی ہے۔ واللہ اعلم۔

کامیابی کا مدار ایمان وعمل صالح میں ہے

محمد امین حسنی ندوی

یہ ایک سچ ہے کہ برائی کبھی اچھائی کی جگہ نہیں لے سکتی یہ بھی ایک سچ ہے کہ اچھائی کو برائی کی جگہ نہیں رکھا جاسکتا انسان کو بنانے والے خدا نے انسان کی زندگی کا امن وسکون اور اس کی خوشی وشادمانی کو ایمان اور عمل صالح سے وابستہ کردیا ہے انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے یہ بنائی ہے کوئی بھی انسان چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو کسی بھی عقیدہ کا حامل ہو وہ اگر کچھ چاہے گا تو صرف یہی چاہے گا کہ اس کی زندگی میں سکون ہو اطمینان ہو مال ودولت ہو اور آرام سے زندگی گذراتا ہو لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ اس بات کو بھی بیان کردیا کہ دنیا کی خوشیاں گھر کا امن وسکون دو کام کرنے سے حاصل ہوسکتے ہیں اور صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت کی زندگی میں بھی راحت انہی دو کاموں سے ملے گی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ (النحل/۹۷)﴾ ایمان کی حالت میں جو بھی بھلا کام کرے گا وہ مرد ہو یا عورت ہم اس کو ضرور پاکیزہ زندگی بخشیں گے اور جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ان کے بہترین کاموں کا بدلہ ہم ان کو ضرور عطا کریں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿الَّذِينَ آمَنُواْ وَلَمْ يَلْبِسُواْ إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَـئِكَ لَهُمُ الأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ (الانعام/۸۲)﴾ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ذرا بھی شرک کی آمیزش نہ کی امن تو انہی کے لیے ہے اور وہی لوگ ہدایت پر ہیں۔

ایمان اور اعمال صالحہ ایک ایسی بنیاد ہے جو انسان کو دنیا کی تنگیوں اور دنیا کی پریشانیوں سے نکال کر آخرت کی نعمتیں عطا کرتی ہے اور دنیا کی خوشیاں دیتی ہے اعمال صالحہ انسان کو اس کی زندگی میں بھی خوشیاں دیتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! مرنے والے کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں (۱) اس کے گھر والے (۲) اس کا مال (۳) اس کا عمل! دو واپس آجاتے ہیں ایک ساتھ رہتا ہے گھر والے اور اس کا مال ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جبکہ اعمال اس کا ساتھ دیتے ہیں باپ بیٹے بھائی جتنے بھی رشتے دار یا دوست ہیں سب اس کو قبر کے تنگ وتاریک گڈھے میں ڈال آتے ہیں کوئی نہیں سوچتا کہ اب کیا ہوگا اس وحشت سے کیسے بچا جائے گا اور اس کا پیسہ مال ودولت جو کچھ کمایا ہے چاہے وہ عالیشان محلوں یا بنگلوں میں رہتا ہو نہ وہ بنگلے بچا سکتے ہیں نہ ہی وہ عالیشان محل بلکہ اس وقت وہ وبال جان بنے ہوں گے آدمی یہ سوچے گا کہ کاش ہم نے مال ہی نہ کمایا ہوتا کاش ہم نے اپنی پوری زندگی صرف پیسوں کی نذر نہ کی ہوتی قبر کی وحشتناک کوٹھری میں انسان کے اگر کوئی چیز صرف کام آئے گی تو وہ اس کے نیک اعمال ہیں یہی اعمال قبر میں اس کا ساتھ دیں گے اگر اچھے اعمال ہیں خیر کے ہیں تو نعمتیں ہی نعمتیں ہونگی اور اگر برے اعمال ہیں تو عذاب ہی عذاب ہوگا۔

﴿وَالْعَصْرِ ☆ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ☆ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (الانعام/۱۔۳)﴾ زمانے کی قسم یقیناً انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔

حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اعمال صالحہ قبر میں اپنے ساتھی کے پاس اچھی صورت میں آئیں گے خوبصورت چہرے کے ساتھ اچھے لباس میں خوشبو ان سے آرہی ہوگی اور اپنے ساتھی سے کہیں گے بشارت قبول کر اپنے نیک اعمال کی مردہ کہے گا تم کون؟ وہ کہے گا میں تمہارے نیک اعمال ہوں اسی طرح بداعمال شخص کے پاس بدصورت شخص آئے گا بدترین شکل میں گندے کپڑے، بدبودار، جس سے آدمی کو کراہیت ہو وہ آکر کہے گا اپنی بداعمالیوں کی بشارت قبول کرو یہ وہ

دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا وہ کہے گا تم کون ہو جو شر لے کر آئے ہو وہ کہے گا ہم تمہاری بداعمالیاں ہیں۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ زندگی دی ہے آرام وراحت کے لیے نہیں، گھومنے پھرنے کے لیے نہیں، کمانے اور اڑانے کے لیے نہیں، صرف کھانے پینے کے لیے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو دنیا کو مومن کے لیے قید خانہ نہ قرار دیا گیا ہوتا، دنیا کو تو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے، کھیتی جبتک تیار نہ ہو خرچ ہی خرچ ہے، جتائی کا خرچ، کھاد کا خرچ، بیج کا خرچ، پانی کا خرچ، پھر کٹائی کا خرچ اس طرح دنیا کی زندگی کا معاملہ ہے، تکلیفیں، مشقتیں، قربانیاں، آزمائشیں، امتحانات، اب جو اس میں پورا اترا صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، برداشت در برداشت سے کام لیتا رہا، دل کو مارتا رہا، خواہشات کو کچلتا رہا، لذتوں سے منھ چراتا رہا، اور گناہوں سے اپنے کو بچاتا رہا، اچھے کاموں میں سبقت لیجاتا رہا وہ اس امتحان میں پورا اترا اور اس آزمائش میں کھرا ثابت ہوا جس کے لیے یہ دنیا قائم کی گئی ہے اور اس کے لیے اس کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (الملک/۲)﴾ وہ وہی ذات ہے جس نے موت وزندگی کو بنایا تاکہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں اچھا عمل کرنے والا ہے۔

اعمال صالحہ میں صرف یہ نہیں آتا کہ انسان عبادت میں دل لگائے اور فرائض کی پابندی کرے اور حقوق اللہ میں کوتاہی نہ کرے بلکہ اعمال صالحہ کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کی زندگی کیسی ہے؟ اس کے اخلاق کیسے ہیں؟ اس کا کردار کیسا ہے؟ وہ جھوٹ نہ بولتا ہو، وعدہ خلافی نہ کرتا ہو، کسی کا حق نہ مارتا ہو، کسی پر ظلم نہ کرتا ہو، چوری نہ کرتا ہو، کسی کے ساتھ بدسلوکی نہ کرتا ہو، اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہو، بڑوں کی عزت کرتا ہو، چھوٹوں سے محبت کا معاملہ رکھتا ہو، خندہ پیشانی سے ملتا ہو، کسی کے ساتھ برا سلوک نہ کرتا ہو، کیوں کہ اعمال صالحہ کا اثر انسان کی انفرادی زندگی میں بھی پڑتا ہے، عائلی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی، اب اگر اعمال صالحہ کا اثر انسان کی انفرادی، عائلی اور معاشرتی میں نظر نہیں آتا تو پھر اس کو اپنی نیت اور اپنی کمائی پر غور کر لینا چاہیے۔

بقیہ: سجدہ سہو کے احکام ومسائل

لکھنے سے سجدہ واجب نہیں: اگر کوئی شخص زبان سے پڑھے تو آیت سجدہ کو لکھے خواہ قلم سے یا کمپیوٹر وغیرہ کے ذریعہ، یا آیت سجدہ کے حروف الگ الگ کر کے ہجے کر کے پڑھے تب بھی سجدہ واجب نہیں ہوگا۔ (شامی: ۱/۶۶۵)

سجدۂ تلاوت کا طریقہ: سجدۂ تلاوت میں ایک سجدہ کرنا رکن اور فرض ہے، لیکن بعض حالات میں رکوع یا اشارہ بھی اس کے قائم مقام ہوجاتا ہے، جیسے نماز پڑھنے والا آیت سجدہ پڑھنے کے بعد رکوع کرلے تو وہ سجدۂ تلاوت کے قائم مقام ہوجاتا ہے، اور مریض شخص سجدہ کے بجائے سر جھکا کر اشارہ کرلے تو اس سے بھی سجدہ ادا ہوجاتا ہے، اور مسنون یہ ہے کہ سجدہ کے لیے جاتے وقت بھی تکبیر کہے اور اٹھتے وقت بھی تکبیر کہے، اور مستحب یہ ہے کہ سجدہ کرنے سے پہلے کھڑا ہوجائے اور سجدہ مکمل کر کے بھی کھڑا ہوجائے، لیکن اگر بیٹھے بیٹھے سجدہ کیا اور سجدہ کرنے کے بعد بھی بیٹھا رہا تو سجدہ ہوجائے گا، اس سجدہ کے لیے نہ تو تکبیر تحریمہ ہے، نہ تشہد ہے، نہ سلام پھیرنے کی ضرورت ہے۔ (شامی: ۱/۶۶۷)

سجدۂ تلاوت اگر فرض نماز میں پڑھنے کی نوبت آئے تو سجدہ میں نماز والی تسبیح یعنی ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پڑھنا چاہیے، لیکن اگر سجدہ کی نوبت نفل نماز میں آجائے یا سجدۂ تلاوت نماز سے باہر ادا کر رہا ہے تو تسبیح کے ساتھ ماثورہ دعائیں بھی پڑھ سکتا ہے۔ (شامی: ۱/۵۶۷-۵۶۸) چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رات کو آنحضرت ﷺ سجدۂ تلاوت میں یہ دعا پڑھتے تھے:

''سَجَدَ وَجْهِی لِلَّذِیْ خَلَقَهٗ وَ شَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَ قُوَّتِهٖ'' (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو سجدۂ تلاوت میں یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا:

''اَللّٰهُمَّ اکْتُبْ لِیْ بِهَا عِنْدَكَ أَجْرًا وَحُطَّ عَنِّیْ بِهَا وِزْرًا وَاجْعَلْهَا لِیْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَتَقَبَّلْهَا مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ'' (ترمذی، ابن ماجہ)

محبت اور نفرت کا معیار

محمد ارمغان بدایونی ندوی

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ (رضی اللہ عنہ) عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ. (سنن أبي داؤد: ٤٦٨٣)

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے خدا کے لیے محبت کی اور خدا کے لیے غصہ کیا، اور خدا کے لیے دیا، اور خدا کے لیے روکا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

فائدہ:- دین اسلام اپنے متبعین سے اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کی ہر نقل وحرکت خدا کے لیے ہو، ان کے ہر عمل میں رضائے الٰہی کے حصول کا مقصد پوشیدہ ہو، ان کی نیت کا تمام تر محور خدا سے تقرب ہو، اور یہ چیز اپنے اندر ایسی مضبوط ہو کہ اس کے سامنے رشتہ داریاں، قرابتیں، معاملات، تعلقات بھی ثانوی درجہ رکھتے ہوں، بلکہ اگر ان کے نباہنے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حق تلفی کا اندیشہ ہو تو قرآنی تقاضا یہ ہے کہ انسان اولیت خدا اور اس کے رسول ﷺ کو دے، ارشاد الٰہی ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ (المجادلة: ٢٢) (جو لوگ خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے، خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں)

اسی لیے قرآن مجید میں حقیقی دوست انہیں کو بتایا گیا ہے جن کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ اہم قوانین الٰہیہ پر بلا کم وکاست تعمیل ہو، اور ایسے لوگوں سے قربت بڑھانے پر بھی بعض جگہ ابھارا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾ (المائدة: ٥٥) (تمہارے دوست تو خدا اور اس کے پیغمبر اور مومن لوگ ہی ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور (خدا کے آگے) جھکتے ہیں)

مذکورہ حدیث میں محبت ونفرت کا یہ معیار بیان ہوا ہے، اور اس کو تکمیل ایمان میں شمار کیا گیا ہے کہ انسان اپنے ہر کام کو خالص اللہ کے لیے کرے، کسی سے محبت ہو تو اللہ کے لیے ہو، کسی سے نفرت ہو تو اللہ کے لیے ہو، کسی کو کچھ دینا دلانا ہو تو اللہ کے لیے ہو، کسی کو نہ دینا ہو، کسی چیز سے روکنا ہو تو اللہ کے لیے ہو، واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان کا ایسا مزاج بن جائے تو وہ غیر معمولی ترقی کرسکتا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں پھر اس کا ہر عمل عبادت سے تعبیر ہوگا، وہ اپنے ہر عمل میں چاق وچوبند نظر آئے گا، دنیا کے روٹھنے کی اس کو کوئی پرواہ نہ ہوگی، اس کے مدنظر صرف اور صرف خدا کی رضا ہوگی، اس سے خواہ کوئی ناراض ہو یا خوش ہو، اس کی بات کسی کے حق میں ہو یا غیر حق میں، وہ ان تمام تفصیلات میں ہرگز نہیں جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج انسان کی سوچ ہی تبدیل ہوگئی ہے، خاص دینی امور کے علاوہ کسی کا شاید ہی اس بات کی طرف ذہن جاتا ہو کہ ہر عمل میں خدا تعالیٰ کا استحضار ہونا چاہیے، ہر کام اسی کے واسطہ ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ انسان آج خدا تعالیٰ کی غلامی سے زیادہ اپنے نفس کی غلامی میں مست ہے، بہت کم لوگ ایسے ہیں جو نفس کی رضا کو نہ دیکھتے ہوں، بلکہ اکثریت انہیں لوگوں کی نظر آتی ہے جو ہر کام میں اپنے نفس کے آخری حد تک غلام ہیں، مسلم معاشرہ میں مسرفانہ تقریبات، فواحش کا عموم، حرام مال کی کثرت، حقوق العباد کی ادائیگی میں غفلت اور سست روی، درحقیقت یہ سب چیزیں نفس کی غلامی کا مظہر ہیں، اور انسان اپنے نفس کو موٹا کرنے میں اس حد تک گر جاتا ہے کہ اس کو کسی کی خوشی نظر نہیں آتی۔

نفس کی اس غلامی سے آزادی کا آسان اور واحد حل یہی ہے کہ ہر کام میں رضائے الٰہی کا جذبہ کارفرما رہے، اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوگا کہ انسان خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی مقرب بندوں میں شمار ہوگا، اور دنیا میں بھی اس کو ہر طرح کا خیر حاصل ہوگا، اگر کسی چیز کے حصول کی نیت ہو اور وہ نہ مل سکے تو دل نہ ٹوٹے گا، بلکہ صبر سے کام لے گا اور اگر مل جائے تو جذبہ شکر میں اضافہ ہوگا، اس طرح اس کی زندگی ایک معیاری اور نمونہ والی بابرکت زندگی بن جائے گی۔

عیدالاضحیٰ

چند ضروری احکام ومسائل

قربانی کس پر واجب ہے: قربانی ہر اس مسلمان، مرد وعورت، مقیم پر واجب ہے، جس کے پاس قربانی کے دنوں میں قرض وضع کرنے کے بعد بقدر نصاب سونا یا چاندی کی قیمت ہو جو حوائج اصلیہ مثلاً رہنے کے گھر اور سواری کرنے کے اسباب وغیرہ سے زائد ہو۔ قربانی کا نصاب صدقہ فطر کے نصاب کی طرح ہوتا ہے، زکوٰۃ کے نصاب کی طرح نہیں ہوتا، چنانچہ قربانی واجب ہونے کے لیے نہ سال گزرنا شرط ہے نہ مال میں نمو ہونا، اگر ان ایام میں کسی کے پاس ساڑھے سات تولہ (تقریباً ۸۷ گرام) سونا یا ساڑھے باون تولہ (تقریباً ۶۱۲ گرام) چاندی یا اتنی چاندی کے بقدر روپیہ یا کوئی فالتو سامان مثلاً رہنے کے گھر کے علاوہ زائد گھر ہے جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس سے زائد ہے تو اس پر قربانی واجب ہو جائے گی جب کہ زکوٰۃ اس وقت فرض ہوتی ہے جب مال پر سال گزر جائے، اسی طرح غیر نامی اسباب جیسے گھر پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی خواہ وہ رہائشی ضروریات سے زائد ہی کیوں نہ ہو۔

کن جانوروں کی قربانی جائز ہے: قربانی میں صرف تین جنس کے جانور متعین کر دیئے گئے ہیں:

(۱) بکرا بکری اور اس کی جنس جیسے بھیڑ اور دنبہ وغیرہ یہ جانور صرف ایک کی طرف سے کفایت کرتے ہیں، ان کی قربانی کا ذکر کئی احادیث میں وارد ہوا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے: ''حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دو سینگوں والے سیاہ وسفید رنگ کے بکروں کی قربانی فرمائی''۔ (متفق علیہ)

(۲) گائے اور اس کی جنس مثلاً بھینس اس کی قربانی سات افراد کی طرف سے ہو سکتی ہے۔

(۳) اونٹ کی جنس اس کی قربانی بھی سات افراد کی طرف ہو سکتی ہے، گائے اور اونٹ کی قربانی جائز ہونے اور سات افراد کی طرف سے کافی ہونے کا ذکر بھی کئی احادیث میں آیا ہے، مثلاً ''حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: گائے سات افراد کی طرف اور اونٹ سات افراد کی طرف سے کفایت کریں گے''۔ (مسلم ابوداؤد)

ان جانوروں کے علاوہ کسی اور جانور مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ کی قربانی درست نہیں ہوگی خواہ پالتو ہی کیوں نہ ہو۔

جانوروں کی عمریں: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ صرف مسنہ کی قربانی کیا کرو، الا یہ کہ تم پر دشواری ہو جائے تو چھ ماہ والے دنبہ کی قربانی کر لو''۔ (مسلم)

اس حدیث کی بنیاد پر فقہاء فرماتے ہیں کہ اونٹ، گائے، بھینس اور بکرے کی نر و مادہ کا مسنہ ہونا ضروری ہے ورنہ قربانی نہیں ہوگی صرف دنبہ کا اگر چھ ماہ یا اس سے زیادہ ہو اور اتنا فربہ ہو کہ سال بھر کا لگتا ہو تو اس کی قربانی درست ہوگی، اور اونٹ میں مسنہ وہ ہے جو پانچ سال مکمل کر چکا ہو اور چھٹے سال میں داخل ہو چکا ہو، گائے اور بھینس میں مسنہ وہ ہے جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو گیا ہو، بکرے اور بھیڑ وغیرہ میں مسنہ وہ ہے جو ایک سال مکمل کر چکا ہو اور دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو، اگر ان ذکر کردہ عمروں سے ایک دن بھی کم کا ہو تو قربانی صحیح نہیں ہوگی۔

جس کو قربانی کرانی ہو وہ کیا کرے؟

جس شخص کو قربانی کرانی ہے اس کے لیے افضل اور مستحب یہ ہے کہ ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہونے سے لے کر جب تک قربانی نہ کرالے نہ ناخن ترشوائے، نہ جسم کے کسی بھی حصہ سے بال صاف کرے اس لیے کہ حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب عشرہ ذی الحجہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کسی کا ارادہ قربانی کرانے کا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے بال اور ناخون کو ہاتھ نہ لگائے''۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''تو نہ بال کٹوائے نہ ناخن ترشوائے''۔ دوسری روایت میں ہے ''جو ذی الحجہ کا چاند دیکھے اور اس کا ارادہ قربانی کرانے کا ہو تو اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے''۔ (مسلم)

قربانی کے ایام: قربانی کے ایام تین ہیں، دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ، اس کا وقت ۱۰ ذی الحجہ کو طلوع شمس کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور ۱۲ ذی الحجہ کے غروب شمس تک رہتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ان دونوں حضرات نے فرمایا: اضحیٰ (ایام قربانی) یوم الاضحیٰ ۱۰ ذی الحجہ دو دن بعد

تک ہے(مالك في الموطأ)، لیکن ان ایام میں سب سے زیادہ افضل پہلا دن پھر دوسرا دن پھر تیسرا دن ہے۔

جانور کیسا ہو: افضل یہ ہے کہ خوب عمدہ اور بہترین جانور کی قربانی کرے، اور نیت صحیح رکھے ورنہ پورا ثواب رائیگاں جانے کا اندیشہ رہے گا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاءُ هَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (اللہ تعالیٰ کو قربانی کے جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، اللہ تعالیٰ کو تو تمھارا تقویٰ-اور نیت-پہنچتی ہے)۔

جس جانور کی قربانی کرنا ہو اس کو تمام عیوب سے خالی ہونا چاہیے، البتہ اگر معمولی عیب ہو تو قربانی صحیح ہو جائے گی۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو حکم دیا کہ ہم جانور کی آنکھ اور کان کا بغور جائزہ لے لیں اور ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کے کان سامنے یا پیچھے سے کٹے یا پھٹے یا سوراخ والے ہوں" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: "قربانی کے جانور میں کن عیوب سے بچنا چاہیے؟ تو آپ ﷺ نے ہاتھ سے چار کا اشارہ کر کے فرمایا: "(۱) وہ لنگڑا جانور جس کا لنگ ظاہر ہو، (۲) وہ کانا جانور جس کا یک چشم ہونا ظاہر ہو، (۳) وہ بیمار جانور جس کا مرض ظاہر ہو، (۴) لاغر جانور جس کے گودا ہی نہ ہو" (موطأ، مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد)۔

انھیں احادیث کے پیش نظر فقہاء نے عیوب کے سلسلہ میں مندرجۂ ذیل تفصیلات بیان فرمائی ہیں:-

۱- جو جانور اندھا یا کانا ہو، یا ایک آنکھ کی تہائی روشنی یا اس سے زیادہ جاتی رہی ہو اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔

۲- جس جانور کا ایک کان تہائی یا اس سے زیادہ کٹ گیا اس کی قربانی بھی درست نہیں ہے، اس سے کم کٹا ہو تو قربانی کی جا سکتی ہے۔

۳- جس جانور کی دُم تہائی یا اس سے زیادہ کٹ گئی ہو اس کی قربانی بھی درست نہیں ہے۔

۴- جو جانور اتنا لنگڑا ہے کہ صرف تین پیروں سے چلتا ہے؛ چوتھا پاؤں زمین پر رکھتا ہی نہیں ہے، یا رکھتا تو ہے لیکن اس سے چل نہیں سکتا تو اس کی قربانی درست نہیں ہے، اور اگر چلتے وقت وہ پاؤں زمین پر ٹیک کر چلتا ہے، اور چلنے میں اس پر کچھ بوجھ ڈالتا ہے لیکن لنگڑا کر چلتا ہے تو اس کی قربانی درست ہے۔

۵- اگر جانور بالکل لاغر اور مریل ہے، اس کی ہڈیوں تک میں گودا نہیں بچا ہے تو اس کی قربانی درست نہیں ہے، لیکن اگر اس حد تک لاغر نہیں ہے تو افضل تو بہر حال فربہ جانور کی قربانی کرنا ہے- جیسا کہ گزر چکا ہے- لیکن بہر حال اس جانور کی بھی قربانی درست ہے۔

۶- جس جانور کے بالکل دانت نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں ہے، اور اگر کچھ دانت گر گئے لیکن جتنے گرے ہیں ان سے زیادہ موجود ہیں تو اس کی قربانی درست ہے۔

۷- جس جانور کے پیدائشی طور پر ہی کان نہیں ہیں اس کی قربانی بھی درست نہیں ہے، البتہ اگر کان ہیں لیکن چھوٹے چھوٹے ہیں تو اس کی قربانی درست ہے۔

۸- جس جانور کے پیدائشی طور پر سینگ نہیں ہیں، یا پیدائشی طور پر تھے لیکن بعد میں ٹوٹ گئے تو اس کی قربانی درست ہے، البتہ اگر بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں تو قربانی درست نہیں ہے۔

۹- جس طرح غیر خصی جانور کی قربانی جائز ہے اسی طرح خصی جانور کی بھی قربانی جائز ہے؛ اس لیے کہ خصی ہونا کوئی عیب نہیں ہے اس سے تو اس کے گوشت کی لذت بڑھ جاتی ہے، اور حدیث شریف میں صراحت کے سے آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو خصی بکروں کی قربانی کی۔ البتہ جس جانور کا نر یا مادہ ہونا واضح نہ ہو اس کی قربانی درست نہیں ہے۔

۱۰- خارش زدہ جانور کی قربانی بھی درست ہے، البتہ اس سے اگر اتنا لاغر ہو گیا جس کی تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے تو اس کی قربانی درست نہیں ہے۔

قربانی کے ایام: ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کی صبح صادق سے لے کر بارہویں ذی الحجہ کے سورج کے غروب ہونے تک اس کا وقت ہے، لیکن جہاں عید کی نماز درست ہوتی ہے وہاں عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ حضرت جندب بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں: میں نے قربانی کے دن نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز میں شرکت کی، پھر جب آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ نماز سے پہلے ہی جانور ذبح کر دیے گئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے نماز سے پہلے قربانی کر لی ہے وہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے، اور جس نے قربانی نہیں کی ہے وہ اللہ کے نام سے قربانی کر لے" (متفق علیہ)۔

ہاں اگر کوئی ایسی چھوٹی بستی میں رہتا ہے جہاں عیدین اور جمعہ کی نماز درست نہیں ہوتی، وہاں طلوع فجر کے بعد ہی قربانی کی جاسکتی ہے، اور شہر کے باشندے بھی وہاں اپنا جانور بھیج کر طلوع فجر سے پہلے قربانی کراسکتے ہیں۔

ان تین ایام میں رات دن کسی وقت بھی قربانی کرائی جاسکتی ہے، لیکن سب سے افضل دن پہلا ہے، پھر دوسرا، پھر تیسرا، اور فقہاء نے اس اندیشہ سے رات میں قربانی کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے کہ روشنی کم ہونے کے سبب کہیں ایسا نہ ہو کہ رگیں صحیح طور سے کٹ نہ سکیں؛ لہٰذا اگر روشنی کا ایسا معقول نظم ہو کہ اس طرح کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو ان شاء اللہ یہ کراہت نہ ہوگی۔

قربانی کا طریقہ: اپنی قربانی افضل یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کی جائے، ہاں اگر خود ذبح کرنے پر قادر نہیں ہے تو دوسرے سے ذبح کرانا بھی جائز ہے، اس صورت میں اس کے لیے افضل یہ ہے کہ قربانی کے وقت موجود رہے۔

قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں البتہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے، آنحضرت ﷺ جب جانور کو ذبح کرنے کے لیے لٹاتے تھے تو یہ آیت پڑھا کرتے تھے، اس لیے قبلہ رخ لٹاتے وقت اس آیت کا پڑھنا مسنون ہے: ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ☆ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ اللّٰهم منك ولك" پھر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے۔ (احمد، ابوداؤد)

اور یاد ہو تو ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے: "اللهم تقبله مني كما تقبلت من حبيبك محمدٍ وخليلك ابراهيم عليهما الصلاة والسلام"

قربانی کا گوشت: افضل یہ ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے لیے رکھے، ایک حصہ عزیز واقارب میں تقسیم کرے اور ایک حصہ غریبوں میں تقسیم کرے اور اگر چاہے تو پورا گوشت خود بھی استعمال کرسکتا ہے۔

قربانی کی کھال: قربانی کی کھال کوئی چیز بنوا کر اپنے استعمال میں رکھ سکتا ہے، لیکن اگر اس کو فروخت کیا تو اس کو غریبوں پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

لیکن اگر کھال فروخت کردی تو اس کی رقم نہ اپنے اوپر استعمال کر سکتا ہے نہ کسی مالدار کو دے سکتا ہے، اب اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے، یعنی کسی غریب محتاج پر صرف کی جائے، یا کسی ایسے مدرسہ اور ادارہ میں دے دی جائے جہاں ناداروں پر صرف کردی جائے، اس رقم سے نہ تو مدارس کے اساتذہ کی تنخواہ دی جاسکتی ہے، نہ اس سے مدرسہ یا مسجد وغیرہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے، نہ کسی غریب کی تجہیز وتکفین میں لگائی جاسکتی ہے۔

کچھ لوگ جانور کی کھال اور گوشت بطور مزدوری قصاب کو دے دیتے ہیں، ایسا کرنا درست نہیں ہے، قصاب کو پوری مزدوری الگ سے دینا ضروری ہے۔

متفرق مسائل: ۱- کسی پر قربانی واجب نہیں تھی، لیکن اس نے قربانی کی نیت سے جانور خرید لیا تو اب اس جانور کی قربانی واجب ہوگئی، لیکن اگر وہ جانور مرجائے، یا کھو جائے تو دوسرے جانور کی قربانی واجب نہیں ہے۔

۲- کسی پر قربانی واجب تھی، لیکن قربانی کے تینوں دن گزر گئے اور اس نے قربانی نہیں کی، تو ایک بکری یا بھیڑ کی قیمت خیرات کردے، اور اگر جانور خرید لیا تھا تو بعینہٖ وہی جانور صدقہ کردے۔

۳- اگر منت مانی تھی کہ فلاں کام ہوگیا تو قربانی کریں گے، پھر وہ کام پورا ہوگیا تو چاہے مالدار ہو یا نہ ہو اس پر قربانی کرنا واجب ہے، اور اس قربانی کا پورا گوشت فقیروں پر صدقہ کردینا بھی ضروری ہے؛ نہ خود کھائے نہ امیروں کو دے۔

۴- اگر اپنی خوشی سے کسی مردے کے ایصال ثواب کے لیے قربانی کرائی تو جس طرح اپنی قربانی میں خود کھانا اور امیر وغریب ہر طرح کے رشتہ داروں کو تحفہ میں دینا جائز ہے، اسی طرح اس میں بھی جائز ہے۔

لیکن اگر کوئی مرنے والا وصیت کر گیا ہو کہ میرے ترکہ میں میری طرف سے قربانی کی جائے اور اس کی وصیت پر اسی کے مال سے قربانی کی گئی تو اس قربانی کے پورے گوشت اور کھال وغیرہ کا خیرات کرنا ضروری ہے۔

۵- اگر کوئی جانور گابھن ہے تو اس کی قربانی بھی جائز ہے، پھر اگر بچہ زندہ نکلے تو اس کو بھی ذبح کردے۔

قربانی کی اصل روح

محمد نفیس خاں ندوی

عید الاضحیٰ کا تعلق تاریخ اسلام کے ایک نہایت ہی درخشاں باب سے ہے، اگرچہ عام لوگوں کی نظر میں صرف سنت ابراہیمی کی یادگار کے طور پر دی جانے والی جانوروں کی قربانی کی حیثیت سے زندہ ہے، لیکن دراصل یہ حضرت ابراہیم کے اسوۂ حسنہ کی تائید وتجدید ہے، حقیقت اسلام اور شریعت الٰہی کی تعبیر وتصویر ہے، خداوند قدوس کو اسلام کی جس حقیقت سے دنیا والوں کو روشناس کرانا مقصود تھا اس کے لحاظ سے اگر کوئی زندگی اسوۂ حسنہ ہوسکتی تھی تو اولاً حضرت ابراہیم کی زندگی تھی، کیونکہ حضرت ابراہیم ہی اسلام کے پہلے داعی تھے، ان کا وجود یکسر پیکر اسلام تھا، ان کا ہر عمل حقیقت اسلام کا مظہر تھا، جو پیروان اسلام کے لیے اسوۂ حسنہ ہوسکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کے تمام اعمال ابدالآباد تک صفحۂ گیتی میں محفوظ کردیئے اور ان کی قربانی کے تمام پہلوؤں کو بقائے دوام حاصل ہوگیا۔

ذی الحجہ کی نویں تاریخ سے ہی دنیا کے سامنے اسوۂ ابراہیمی کی لازوال زندگی کا عجیب وغریب منظر ہوتا ہے، تاریخ ہزاروں برس کا سفر طے کرنے کے بعد ہر سال اپنے آپ کو دہراتی ہے، تاکہ اسلام کے داعی اول کی زندگی ایک بار پھر اپنے جمال جہاں آرا سے قالب مردہ میں جان ڈال دے اور رہروان حقیقت کے سامنے صبر وضبط، اور ایثار وقربانی کا سبق پیش کردے، میدان حج میں ایک طرح کے لباس میں، ایک ہی سمت کے لیے، دوڑنے والوں کی زبانوں سے "لبیك اللهم لبیك" کی صدائیں نکلتی ہیں تو ان میں کی ہر صدا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی صدا ہوتی ہے، جنہوں نے ہزاروں برس قبل اپنے "خلیل" کی "یا عبدی" کی صدا کے جواب میں عاشقانہ ووالہانہ انداز میں "لبیك و سعدیك" کا نعرہ لگایا تھا۔

حضرت ابراہیم کی پوری زندگی ایثار وقربانی کا اعلیٰ نمونہ تھی، انہوں نے رضائے الٰہی کے آگے اپنے وجود کو فنا کردیا تھا، ان کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ پاک کی خوشنودی کا طالب تھا، کبھی ان کی خواہش اللہ رب العزت کی منشا کے خلاف نہ ہوئی، اللہ کی مرضی کے سامنے نہ بیوی کی چاہت غالب آئی، نہ اولاد کی محبت ان کے پیروں کی زنجیر بن سکی، بے چوں وچرا انہوں نے اپنے رب کے ہر حکم کو مانا، اپنی زندگی اسی کی منشا کے مطابق گذاری اور رہتی دنیا تک کے لیے ایثار وقربانی اور مجسم اسلام کی اعلیٰ ترین مثال پیش کردی۔

حضرت خلیل اپنی قربانیوں میں بظاہر تنہا تھے، لیکن اپنے وجود کے اندر پوری ایک امت رکھتے تھے، ان کی ہر سنت اسلام تھی، حقیقت اسلامی میں ان کا وجود اس طرح فنا ہوگیا تھا کہ خود ان کی کوئی ہستی باقی نہیں رہ گئی تھی، جب انہوں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو اپنے چاروں طرف بت پرستی کے مناظر دیکھے شہروں اور بازاروں میں لوگوں کو بتوں کے آگے سجدہ ریز دیکھا، خود اپنے باپ کو بتوں کو تراشتا اور ان کی پوجا کرتا ہوا پایا، بلاشبہ یہ حقیقت اسلام ہی کا کرشمہ تھا جس نے ان کے دل میں بت پرستی اور اس کے تمام مظاہر سے نفرت وگھن پیدا کردی تھی اور اس ان دیکھے محبوب کے عشق کی آگ لگادی، جس کی زد میں ماسوا خاکستر ہوگیا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب ان کے اہل خاندان سنگ تراش تراش کر رنگا رنگ صورتیں بناتے تھے تو ان کی زبان حقیقت بیان سے یہ انکشاف ہونا فطری تھا کہ تم جن بت پرستیوں میں مبتلا ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں، البتہ مجھے اس اَن دیکھی ذات سے سروکار ہے جس نے میری خلقت کی اور جس نے اس پوری کائنات کو وجود بخشا، جس کے قبضہ قدرت میں دنیا کی ہر چیز ہے اور جو ہمیشہ ہمیش سے ہے اور ہمیشہ ہمیش رہے گا۔

توحید باری کے اعلان کے نتیجہ میں ان کو تکلیفوں سے گزرنا پڑا، دہکتی ہوئی آگ میں ان کو زندہ ڈالا گیا، مگر جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ بھی اسی کا ہوجاتا ہے، انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردیا تھا، چنانچہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں کے سامنے بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، نہ وہ گھبرائے، نہ پس وپیش میں مبتلا ہوئے، دل کے اندر صرف ایک خدا کی بندگی کا جذبہ تھا، چنانچہ انہوں نے نہ کوئی حکمت برتی، نہ کسی طرح کا تأمل کیا، نہ عقل وخرد کی کوئی آواز سنی بلکہ بے خطر آتش نمرود میں کود گئے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

ان کی یہ سپردگی اللہ کو پسند آئی، ان کی جان مطلوب نہ تھی، بلکہ محبت وفنائیت کا یہی جذبہ مقصود تھا، چنانچہ آگ کو حکم ہوا کہ ﴿یَا نَارُ کُونِیْ بَرْداً وَسَلَاماً عَلٰی إِبْرَاهِیْمَ﴾ یعنی اے آگ! ابراہیم کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی ہوجا، یہ قربانی کا آغاز تھا اور اس عظیم قربانی کے لیے راہ کی ہمواری تھی جس کا ہر سال احیاء وتجدید امت مسلمہ کا شعار قرار پایا اور جس سے

بڑھ کر اسلام وسپردگی کی کوئی مثال نہیں۔

شرک وبت پرستی اور اس کے تمام مظاہر سے نفرت اور اللہ وحدہ لا شریک لہ کی محبت، اس کی بندگی کا جذبہ، اس کے راہ میں سب کچھ قربان کردینے کی خواہش اور اپنی عبدیت کا احساس ہی حقیقت اسلام ہے، یہی وہ روح ہے جو حضرت آدم کے قالب میں پھونکی گئی، پھر شریعت ابراہیمی سے منسوب ہوکر اس سلسلہ کی آخری امت یعنی امت محمدیہ ﷺ میں ظہور پذیر ہوئی، یہی انسان کی فطرت اصلی ہے، جسے قرآن کریم نے ''قلب سلیم'' کے لقب سے یاد کیا ہے، اسلام کی اسی حقیقت نے قربانی اور آزمائش کے وقت حضرت ابراہیم کو ثابت قدم رکھا، اسی جذبہ نے ان کے ہاتھ میں چھری تھمادی کہ فرزند عزیز کو ذبح کرکے ماسوی اللہ کی محبت کی قربانی کردیں، اسی حقیقت نے حضرت اسماعیل کی گردن جھکادی تاکہ جان عزیز کو اس کی راہ میں قربان کردیں۔

حضرت ابراہیم نے خواب کی اطلاع دینے کے بعد بیٹے سے جب مرضی چاہی تو وہ فرماں برداری، حکم الٰہی کے سامنے سربسجود ہونے اور راہ خدا میں قربان ہونے کے تمام حدود سے اعلیٰ تھے، انہوں نے جو جواب دیا اس میں پورے اسلام کا نچوڑ آگیا، شریعت اسلامی کا پورا خلاصہ پیش کردیا گیا، جواب دیا: ﴿يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾ یعنی اے ابا حضور! یہ تو اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کا اشارہ ہے، آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اسے بلا تامل بجالائیے، اگر اس کی مرضی ہوئی تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

یہ صدا اسماعیل کی نہیں بلکہ اسلام کی صدا تھی، انہوں نے اپنے ایک جملہ میں رہتی دنیا تک کے لیے پیغام دے دیا کہ اللہ رب العزت کی طرف سے جس کا حکم دیا جائے تو بلا تامل اس کو بجالاؤ، پھر نہ نفس کے تقاضے غالب آئیں، نہ مال ودولت کی چاہت حاوی ہو، نہ بیوی بچوں کا پیار دامن گیر ہو، نہ دنیا کی ہوس سامنے دکھے، نہ موت کا ڈر اور نہ جینے کی تمنا ہو، بس ایک ہی جذبہ، جذبہ اسلام ہو، رب کی خوشنودی کے حصول کی کوشش ہو، اسلام اور مسلمان ہونے کی یہ اعلیٰ ترین مثال تھی، اس سے بڑھ کر چشم فلک نے نہ کوئی مثال دیکھی، اور نہ اب ممکن ہے، باپ بیٹے دونوں منشائے الٰہی کے آگے سرخم کیے ہوئے، ایک اپنے لخت جگر کو قربان کرنے پر کمربستہ تو دوسرا راہ خدا میں جان کا نذرانہ پیش کرنے کو بے چین وبے قرار، یہ حقیقت اسلام ہی کی محویت کا غلبہ تھا جس سے ان کا نفس فنا ہوگیا تھا اور ایمان کو بقا حاصل ہوگئی تھی، ان کی یہ قربانی بارگاہ الٰہی میں نہ صرف قبول ہوئی بلکہ اسے جاویدانی نصیب ہوئی اور رہتی دنیا تک کے لیے مسلمانوں کا شعار قرار پائی۔

اسلام کے معنی کسی چیز کو سونپ دینے اور اطاعت میں اپنی گردن جھکادینے کے ہیں، اسلام کی حقیقت یہی ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے خدا تعالیٰ کے حوالہ کردے، اس کی تمام قوتیں، اس کی تمام خواہشیں، اس کی تمام محبوبات ایک لینے والے کے سپرد ہوجائیں، وہ اپنے تمام قوائے جسمانی کے ساتھ بغاوت مول لے اور احکام الٰہیہ کی اطاعت کو اپنا شعار بنالے، یہی حقیقت اسلام اور قانون فطرت ہے جس کا مطالبہ ہر انسان سے کیا گیا ہے، ہر کسی کی فطرت کو اسی فطرت اسلام سے مربوط کیا گیا ہے، اسی فطرت انسانی کے ساتھ زندگی گذارنے کی ہدایات تمام آسمانی کتابوں میں ہیں، اور تمام انبیاء نے عملاً اس کی دعوت دی تاکہ یہ دنیا امن وآشتی کا گہوارہ بنے اور یہاں بسنے والے اسی ایک خدا کی عبدیت کا مظہر ہوں، جو پوری کائنات کا خالق ومالک ہے، لیکن جب جب فطرت سے بغاوت کی گئی تو خشکی اور تری میں فساد عظیم برپا ہوا اور یہ دنیا وحشت اور زندگی کی آماجگاہ بن گئی، جہاں نہ انسانی جانوں کا احترام بچا اور نہ بندگی خدا کا جذبہ، بلکہ شیطنت کا دور دورہ ہوا اور انسانوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے معبود تراش لیے جو کہ اللہ رب العزت کے غیظ وغضب کا ذریعہ ہے، اور اس کے غضب سے صرف اسی کی ذات بچاسکتی ہے۔

یہی درس حضرت ابراہیم نے اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعہ دیا ہے، اس کی عملی تفسیر کے لیے دونوں باپ بیٹوں نے اگلی قوم میں ایک ایسے برگزیدہ رسول کی دعا کی تھی جو خدا کی آیات پڑھ کر سنائے، علم وحکمت کی تعلیم دے اور نفوس وقلوب کی اصلاح کرے، یہ دعائیں ان زبانوں سے نکلیں تھیں، جن میں سے ایک نے راہ خدا میں جذبات وارادے کی قربانی پیش کی تھی، اور دوسرے نے اپنے جان ونفس کی یعنی دونوں نے اپنے محبوب ترین متاعوں کو راہ الٰہی میں لٹادیا دیا، تھا، خدا نے ان دونوں کی دعا قبول کی اور حضرت محمد ﷺ (فداہ ابی وامی) کلام الٰہی کی مکمل تفسیر بن کر مبعوث ہوئے اور اسلام کو مکمل دین کی صورت عطا کی اور امت محمدیہ کو ان کے ایثار وقربانی، فنائیت وللّٰہیت اور اسلامیت کی تعلیم اس طرح سے دی کہ ﴿مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ﴾ یعنی تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت ہو، انہوں نے تمہارا نام ''مسلمان'' رکھا ہے، اور ایک جگہ

ارشاد فرمایا: "خیر الملل ملة ابراھیم" یعنی ملتوں میں سب سے بہترین ملت ابراہیم کی ملت ہے، غرض کلام پاک نے کامل زندگی کے صرف دو نمونے پیش کیے اور ان کے اتباع کی دعوت دی گئی، ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اور دوسرے محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیات طیبہ۔

عیدالاضحیٰ کے ایام قریب آتے جارہے ہیں، اس کے لیے تیاریاں بھی شروع ہورہی ہیں، جانوروں کی خرید وفروخت کا سلسلہ شباب پر آرہا ہے، اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش ہوگی، اخباروں میں رپورٹیں آئیں گی کہ فلاں نے فلاں جانور اتنی لاگت میں خریدا، نام ونمود کے حصول کی ایک دوڑ ہوگی جس میں نہ جانے کتنی گستاخیاں ہوں گی، عید کے روز مسلمان ان جانوروں کو قربان کردیں گے اور سمجھیں گے کہ سنت ابراہیمی کی یاد کو تازہ کردیا اور ایک فرض ادا ہوگیا، بلاشبہ فرض تو ضرور ادا ہوگیا لیکن شاید ذہنوں میں یہ بات نہ آئی ہو کہ کیا اللہ رب العزت نے حضرت ابراہیم سے کسی جانور کی قربانی چاہی تھی؟ کیا یہ سنت اسی لیے ہے کہ چند پیسوں میں جانور خرید کر ذبح کردیا جائے؟ کیا جانور قربان کرتے وقت دل ودماغ کے کسی گوشہ میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس جانور کے گوشت وخون کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ اس کو پاک وصاف دل مطلوب ہے، اس کے نزدیک جانور سے بڑھ کر اس نفس کی قربانی چاہیے جو ہر برائی پر آمادہ کرتا ہے اور شیطان ملعون کی پیروی کرتا ہے، اپنے جذبات واحساسات کی قربانی چاہیے، اپنی ضروریات ودینی تقاضوں کو خوشنودی رب کے سامنے قربان کردینے کا جذبہ چاہیے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قربانی کے لیے جانور پہلے ہی سے خریدے جائیں، خود ہی اس کی دیکھ بھال کی جائے اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنے ہی ہاتھوں سے اس کی گردن پر چھری چلائی جائے تاکہ اس سے جو انس ولگاؤ پیدا ہوا ہو اس پر جبر کرتے ہوئے حکم الٰہی کے سامنے اس کو قربان کردیں، اور اس طرح نفس کے خلاف کرنے، برائی سے خیر کی طرف اس کا رخ موڑنے کی ایک مشق ہوجائے، اگر یہ جذبہ ہے تو یقیناً آپ کی قربانی بارگاہ الٰہی میں قبول ہے، ورنہ دوسرے بہت سے اعمال کی طرح یہ بھی ایک عمل ہوگا، جو ریاکاری سے پر ہوگا اور جس کی عنداللہ کوئی حیثیت نہیں۔ ﴿لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تک نہ جانور کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ اس کا خون پہنچتا ہے، بلکہ اس کے حضور تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

بقیہ: حج کی سوغات

.....حج کے درمیان آدمی کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب دربار الٰہی میں حاضری دے تو پھر اس کے دل ودماغ، اس کے تصورات میں سوائے خدا کے کوئی موجود نہ ہو، بس وہ ہو اور اس کے خدا کی محبت اس کے دل میں موجیں مار رہی ہو، اسی لیے حج کی جتنی ادائیں ہیں وہ سب اسی محبت پر دلالت کرتی ہیں، اور اسی لیے یہ نعرہ بھی لگانے کا حکم بھی دیا گیا ہے:

"لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك لا شریك لك، لبیك، ان الحمد والنعمة لك والملك، لا شریك لك لبیك"

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے مالک ہم تیرے دربار میں حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں، ایک شرک یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کو شریک کرے، اور دوسرا شرک یہ ہے کہ غیر اللہ کو دکھاوے کے لیے انسان کوئی کام کرے، لیکن دونوں شریک ہی مانے جائیں گے، اسی لیے تلبیہ میں بار بار "لا شریك لك" کا جو لفظ ہے اس میں انہیں دونوں باتوں کی تردید کی گئی ہے، لیکن آج کل شرک اس قدر لوگوں کی سرشت میں مل چکا ہے کہ لوگ ایسے مقامات مقدسہ کو بھی شرک سے خالی نہیں چھوڑتے، حج کے درمیان ایک صاحب کا واقعہ آتا ہے کہ ان کا ایک عرب نے دوران طواف ہاتھ پکڑا، کیونکہ وہ طواف کرتے ہوئے "لبیك یا عبد القادر" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

حج کو ان تمام باتوں سے بالکل پاک رکھنا چاہیے اور حج کے دوران کہیں بھی غیر کا شائبہ نہیں آنا چاہیے، اسی لیے جب پہلے زمانہ میں لوگ حج کو جاتے تھے تو کسی سے نہیں بتاتے تھے، تاکہ کسی طرح کی ریاء کا شائبہ بھی نفس کے اندر داخل نہ ہو، لیکن آج کل نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے؟ حالانکہ یہ سب باتیں بالکل غیر اسلامی ہیں، جن سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے، غرض کہ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ حج کے لیے ہر وقت تیار رہے اور اس کا شوق ہمیشہ بیدار رہے، اور یہ آرزو رکھے کہ اللہ کے دربار میں حاضری نصیب ہوجائے، جس طرح زکاۃ نماز کا تتمہ ہے اسی طرح حج بھی روزہ کا تتمہ ہے، کہ روزہ میں انسان کو اللہ تعالیٰ سے غیر معمولی والہانہ تعلق پیدا ہوتا ہے اور اسی تعلق کی سلگی ہوئی چنگاری کے نتیجہ میں انسان کی لگی ہوئی پیاس کو حج مکمل سیرابی دیتا ہے، لہٰذا جب انسان دربار الٰہی میں حاضری دے دیتا ہے تو اس کی محبت کی پیاس بجھ جاتی ہے اور اس کی بے چینی کی کیفیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

ایام تشریق اور تکبیرات تشریق

نویں ذی الحجہ کی فجر کی نماز کے بعد سے تیرھویں ذی الحجہ کی عصر کی نماز کے بعد تک، ہر فرض نماز کے بعد بلند آواز سے مردوں پر اور آہستہ آواز سے عورتوں پر پڑھنا یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ

اور اگر فرض نماز کے بعد امام تکبیر پڑھنا بھول جائے تو مقتدیوں کو چاہیے کہ وہ بلند آواز سے تکبیر پڑھیں۔ یہ تکبیرات ایک مرتبہ پڑھنا واجب اور تین مرتبہ پڑھنا سنت ہے۔

عید الاضحی کے دن کی سنتیں

☆ صبح کو جلدی اٹھنا ☆ مسواک کرنا ☆ غسل کرنا ☆ اچھے کپڑے پہننا ☆ خوشبو لگانا ☆ عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا ☆ عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا ☆ عیدگاہ جلدی جانا ☆ عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد قربانی کا گوشت کھانا۔ ☆ پیدل جانا ☆ ایک راستہ سے جانا دوسرے راستہ سے واپس آنا ☆ راستہ میں تکبیر تشریق (اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ) پڑھتے ہوئے جانا۔

قربانی کا طریقہ

قربانی کا سنت طریقہ یہ ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف دی جائے، اسے زیادہ تڑپایا نہ جائے، زمین پر لٹانے میں ایسا طریقہ نہ اپنایا جائے کہ جس سے جانور گھبرا کر بدکنے لگے، جب جانور قربان گاہ میں آجائے تو اسے جلد ذبح کرنے کی کوشش کی جائے، چھری اور رسی وغیرہ پہلے سے تیار رکھی جائے، پھر جب قربانی کا جانور قبلہ رخ لٹادے تو پہلے یہ دعا پڑھے:

"اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفاً وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ،
اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، لَا شَرِیْکَ لَہٗ
وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَ لَکَ"

پھر "بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہہ کر ذبح کرے، اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْہُ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ ،وَ خَلِیْلِکَ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْھِمَا الصَّلَاۃُ وَ السَّلَامُ"۔

اگر ایک دوسرے کی طرف سے قربانی کر رہا ہو تو "مِنِّیْ" کے بجائے "مِن" کہے اور "مِنْ" کے بعد جس کی طرف سے قربانی کر رہا ہے اس کا نام لے۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP -19

Volume: 09 | SEPTEMBER 2017 | Issue: 09

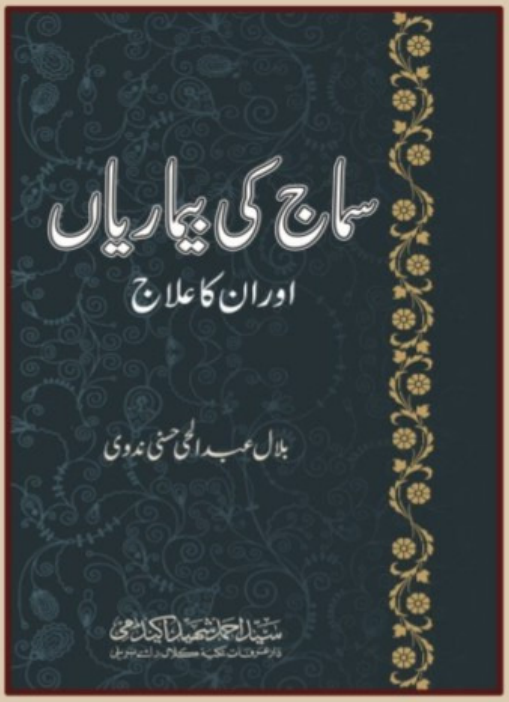

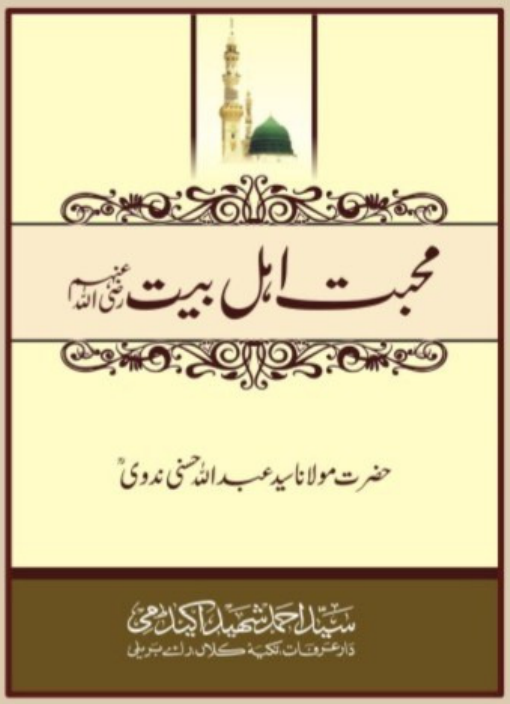

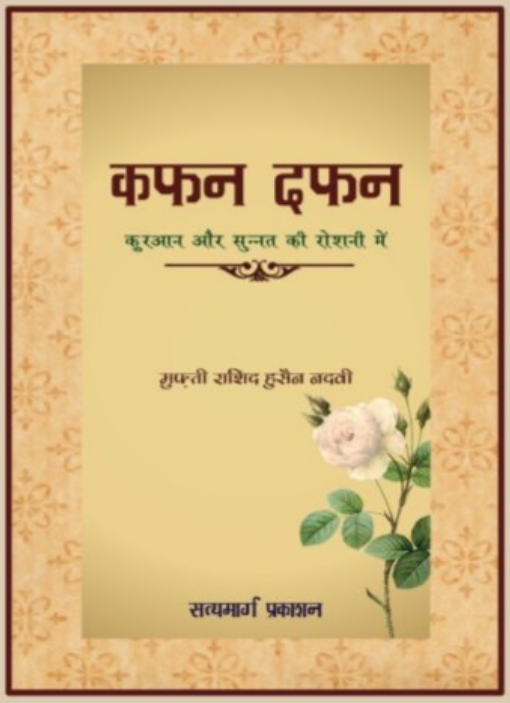

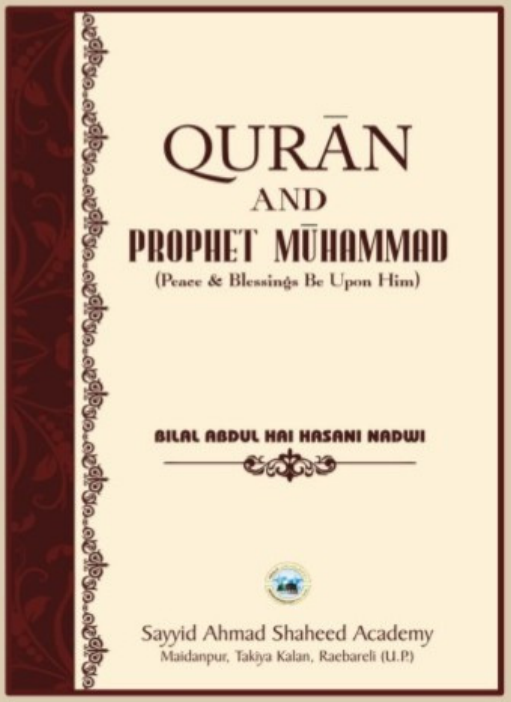

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)